قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی - جون 1982

اس پرچہ میں :-

۱ - عورت - قرآن کے آئینے میں
۲ - پرویز صاحب کا سفر حجاز
۳ - اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسولؐ کا مفہوم

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 6 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

دلِ اشتراک	ٹیلیفون	اِس شمارہ کی قیمت
سالانہ	۸۸۰۸۰۰	۶
ستان -/۳۶ روپے	خط و کتابت	چھ روپے
الک -/۸۶ روپے	ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	
جلد ۳۵	مئی۔ جون ۔ ۱۹۸۲ء	شمارہ ۶/۵

فہرست

۱۔ لمعات ------------------------ ۲

۲۔ قرآنک کالج ------------ (محترم پرویز صاحب) ------ ۸

۳۔ مرض، تشخیص اور علاج ------ (محترم پرویز صاحب) ------ ۹

۴۔ حقائق و عبر ------------------------ ۵۳

۵۔ درسِ قرآنی کے اعلانات ------------------ ۷۲

۶۔ عورت ــــ قرآن کے آئینے میں ---------------- ۷۳

۷۔ کیا سائنس زندگی پیدا کر سکتی ہے؟ ------------ ۱۰۰

۸۔ کہاں میں کہاں یہ مقام ــــ اللہ! اللہ! ------------ ۱۰۵

(محترم پرویز صاحب کا سفرِ حجاز)

۹۔ دنیا کا سب سے پہلا انسان --- (خطیب عبدالرحمٰن عمری۔ آمبور (مدراس)) --- ۱۲۳

۱۰۔ دو اہم کتابیں ------------------------ ۱۲۷ - ۱۲۸

مدیر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ رایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہمارے ہاں ایک مقولہ مشہور ہے (بلکہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک حدیث ہے) کہ الاعمال بالنیات۔ یعنی اعمال (کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار) نیتوں پر ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نیک کام بھی خراب نیت سے کیا جائے، تو اسے نیکی کا کام نہیں کہا جائے گا، تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام طور پر، اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی غلط کام بھی حسنِ نیت سے کیا جائے، تو وہ غلط نہیں رہتا۔ اس کا یہ مفہوم غلط ہے غلط کام غلط ہی رہتا ہے خواہ اُسے کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ سرانجام دیا جائے۔ ہندو، اپنے بتوں کو خدا کا اوتار سمجھ کر، نہایت نیک نیتی اور خلوص سے ان کی پرستش کرتے ہیں، لیکن اس سے بت پرستی نیک عمل تو قرار نہیں پا جاتی! وہ بدستور باطل کی باطل رہتی ہے۔ عیسائی، نہایت نیک نیتی اور حسنِ عقیدت سے حضرت مسیح کو خدا (تثلیث) یا خدا کا بیٹا (ابن اللہ) تسلیم کر کے انہیں مقامِ الوہیت عطا کر دیتے ہیں، لیکن اس سے ان کا یہ عقیدہ مبنی برحق قرار نہیں پا سکتا۔ وہ بدستور گمراہ کن رہتا ہے۔ یہی کیفیت دنیا کے دیگر مذاہب کی ہے جو اپنے باطل عقائد پر نہایت نیک نیتی سے جمے رہتے ہیں اور توہم پرستانہ اعمال کو حسنِ نیت سے نیکی کے کام سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے متشدد مذہب پرست، ہر سال جگن ناتھ جی کے مہیب مجسمہ کے نیچے لیٹ کر، نہایت کرب و اذیت سے جان دے دیتے، اور اسے انتہائی پُن (ثواب) کا کام سمجھتے ہیں۔ خود ہمارے ہاں، آئے دن ایسی خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنے معصوم بیٹے کے گلے پر یہ کہہ کر چھری پھیر دی کہ اسے ایسا کرنے کا خدا کی طرف سے اشارہ ہوا تھا۔ لیکن اس کی نیک نیتی اس قتلِ ناحق کو حسنِ عمل نہیں بنا دیتی۔ دُور کیوں جایئے۔ ہمارے ہاں کی مائیں، اپنے بچوں کو سلانے کے لئے افیون چٹاتی ہیں، لیکن ان کی یہ جاہلانہ ہمدردی، افیون کو تریاق نہیں بنا دیتی۔ وہ بدستور افیون رہتی ہے اور اپنے مہلک اثرات سے بچوں کی صحت کو تباہ کر دیتی ہے۔

لہٰذا، محض نیک نیتی، کسی عقیدہ یا عمل کے صحیح ہونے کا معیار نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ کسی انسان، یا انسانوں کے گروہ (بلکہ قرآن کے الفاظ میں، نوعِ انسان کی اکثریت) کا خیال یا عقیدہ بھی اس باب میں سند یا قولِ فیصل قرار نہیں پا سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ کسی عقیدہ، نظریہ یا مسلک کے غلط یا صحیح ہونے کے لئے ایک خارجی معیار کی ضرورت ہے۔ جو اس معیار کی رُو سے غلط ہے، وہ غلط ہی رہے گا خواہ اسے صحیح سمجھنے والوں کی کتنی ہی بڑی اکثریت کیوں نہ ہو، اور خواہ اس پر عمل پیرا ہونے والوں کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جسے وہ معیار صحیح قرار دے دے، وہ صحیح رہے گا۔ خواہ اس کی تائید میں

ایک ہاتھ بھی نہ اُٹھے سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا معیار کسوٹی ہے، نہ کہ صراف کی زبان۔

(۰)

ہمارے ہاں آجکل "اسلام" کا بڑا چرچا ہے ـــــ اسلامی حکومت۔ اسلامی نظام۔ اسلامی شریعت۔ اسلامی دستور۔ اسلامی قوانین۔ اسلامی نظامِ معیشت، اور نہ معلوم کیا کیا اسلامی! لیکن کیا کسی نے آج تک یہ بھی متعین کیا ہے کہ کسی حکومت، نظامِ شریعت، قوانین، مسلک کے اسلامی (یا غیر اسلامی) قرار پانے کا خارجی معیار کیا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جونہی کوئی معاملہ سامنے آئے، اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی بحث شروع ہو جاتی ہے۔ بعض اسے اسلامی قرار دیتے ہیں۔ دوسرے اسے غیر اسلامی ٹھہراتے ہیں۔ یہ بحث کچھ دنوں تک گرما گرم رہتی ہے تاآنکہ کوئی اور معاملہ سامنے آجائے۔ بحثوں کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور حتمی اور یقینی طور پر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ یہ اس لئے کہ کسی معاملہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا کوئی خارجی (اور متفق علیہ) معیار مقرر نہیں۔

اس سے پہلے یہ بحثیں محض نظری اور مذہبی مباحثوں اور مناظروں تک محدود ہوتی تھیں۔ لیکن اب جو حکومت نے اسے مملکتی مسئلہ بنا لیا ہے تو اس کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے۔ اب اگر حکومت کسی قانون کو اسلامی کہہ کر نافذ کرتی ہے تو جو شخص اسے اسلامی تسلیم نہیں کرتا اور اس طرح اس سے سرکشی برتتا ہے، تو "اسلام" کی رُو سے، وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار پا سکتا ہے۔ جب ۱۹۷۹ء میں "اسلامی احکام" کی پہلی قسط نافذ ہوئی تھی تو (مرحوم) مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ

> صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق نے عید میلاد النبیؐ کے روز چند اہم اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کا جو اعلان کیا ہے وہ ان بے شمار نعمتوں اور مدحیہ تقریروں سے زیادہ قیمتی ہے جو رسول اکرمؐ کی شان میں کی اور کہی گئی ہیں۔ اس لئے کہ حضورؐ کی محبت کا اصل تقاضا تو آپؐ کے لائے ہوئے دین کو قائم کرنا اور آپؐ کے دیئے ہوئے احکام کو نافذ کرنا ہے جس کی نہایت مبارک اور قابلِ تحسین ابتداء، صدرِ پاکستان کے اس اعلان سے ہوئی ہے۔ یہ پاکستان کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ اپنے جس مقدس وجود سے وہ (۳۲) سال تک محروم رہا، اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ اس کی راہ پر گامزن ہو رہا ہے۔ تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ربِ کریم کے شکر گذار ہوں اور اس نعمت کی ناقدری کر کے اس کی رحمت کے بجائے لعنت کے مستحق نہ بنیں۔ اجرائے احکامِ اسلامی کا اعلان ہو جانے کے بعد صدرِ مملکت اور ان کی حکومت، انتظامیہ، اور عدلیہ کے احکام اور عام مسلمان سب بڑی آزمائش میں پڑ گئے ہیں۔ انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

(ہفت روزہ۔ ایشیا۔ لاہور۔ ۱۱ر فروری ۱۹۷۹ء)

ان احکام و قوانین کی اہمیت کا تو یہ عالم تھا اور ان کے "اسلامی" ہونے کی یہ کیفیت کہ، ہنوز ان کی دوشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ خود صدرِ مملکت نے اعتراف و اعلان کیا کہ ان پر عمل کیا جانا ممکن نہیں۔ حکومت نے زکوٰۃ کا قانون نافذ کیا تو شیعہ حضرات کے احتجاج پر، حکومت کو اس قانون میں یہ ترمیم کرنی پڑی کہ وہ اپنی فقہ کے مطابق ادائیگی زکوٰۃ کر سکتے ہیں۔ اور جب ایک فرقے کے حق میں یہ استثناء جائز قرار پا گئی تو پھر تمام فرقوں کو اس کی اجازت دینی پڑی (بجز ان کے جو قرآنی فقہ کے پابند ہیں) رجم کے حکم کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ وہ خلافِ اسلام ہے، تو خود حکومت کو اس فیصلے کے خلاف (پہلے اپیل کرنی پڑی اور پھر) اسی عدالت کو اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے کہا گیا۔ (نظرِ ثانی کا یہ مقدمہ زیرِ سماعت ہے)۔

یہ ان قوانین کے سلسلہ میں ہے جو نافذ ہو چکے ہیں۔ جو ہنوز زیرِ تدوین ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ ـــــ ڈور کو سلجھا رہے ہیں، اور سرا ملتا نہیں۔

یہ سب کیوں ہے؟ اس لئے یہ طے نہیں پایا کہ کسی معاملہ کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا خارجی معیار کیا ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت، قوم کو دانستہ اس طرف آنے نہیں دیتی۔ اس لئے کہ اگر اسلامی یا غیر اسلامی کا کوئی خارجی معیار مقرر ہو جائے تو ان کے مختلف فرقے باقی نہیں رہ سکتے۔ ایک دفعہ حالات انہیں گھیر کر اس طرف لائے تھے، لیکن اس کا جو تلخ تجربہ انہیں ہوا، اس کے بعد وہ بھولے سے بھی اس سمت کا رُخ نہیں کرتے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوّت کے سلسلہ میں جو فسادات برپا ہوئے تھے، ان کی تحقیقات کے لئے حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ جسٹس محمد منیر (مرحوم) اس کے پریذیڈنٹ اور جسٹس کیانی (مرحوم) اس کے ممبر تھے۔ پاکستان کے مختلف فرقوں کے نمائندگان (علماء حضرات) کا مطالبہ تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ تحقیقاتی عدالت نے ان سے کہا کہ یہ طے کرنے کے لئے کہ احمدی مسلمان ہیں یا نہیں، یہ فیصلہ کرنا ضروری ہوگا کہ مسلمان کہتے کسے ہیں؟ انہوں نے یہ سوال ان علماء کرام سے پوچھا۔ اس عدالت کی رپورٹ شائع شدہ موجود ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے صفحات کے صفحات تحریر کرنے پڑیں گے۔ دوسروں نے کہا کہ اس کے لئے کئی دن درکار ہوں گے۔ جنہوں نے جواب دیا ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ ان جوابات کی روشنی میں عدالت نے لکھا کہ

> ان جوابات کو دیکھتے ہوئے جو ان علماء نے دیئے، ہم اس سے زیادہ کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے کہ کوئی دو عالم بھی ایک دوسرے کے ساتھ متفق نہیں تھے۔ جس طرح ان علماء نے کیا ہے، اگر ہم خود مسلمان کی (DEFINITION) متعین کریں، اور وہ دوسروں کے جواب سے مختلف ہو، تو وہ متفقہ طور پر ہمیں دائرۂ اسلام سے باہر نکال دیں گے۔ اور اگر ہم ان علماء کے جوابات میں سے کسی ایک کے جواب کو صحیح

تسلیم کر لیں، تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان قرار پا جائیں گے لیکن دوسروں کے نزدیک کافر ٹھہریں گے۔ (صفحہ ۲۱۸)

یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ لیکن اگر آپ آج بھی ان سے کہیں کہ وہ متفقہ طور پر بتائیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور کسی معاملہ اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا خارجی معیار کیا ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات کس طرح بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے انہوں نے "کتاب و سنت" کی اصطلاح وضع کر رکھی ہے، جو اس سے بھی زیادہ مبہم اور متنازعہ فیہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ان حضرات نے مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں۔ اربابِ حکومت نے کہا کہ یہاں مسلمانوں کے اس قدر فرقے ہیں۔ ان کی موجودگی میں، ایک ایسا ضابطۂ قوانین کیسے مرتب ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں؟ انہوں نے کہا کہ اس کے لئے ہم ایک متفق علیہ فارمولا پیش کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندہ (۳۱) علماء کی ایک کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ ملک کا قانون "کتاب و سنّت" کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ان "متفق علیہ فارمولا" پیش کرنے والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سنّت ..... ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے اس معیار کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس فارمولا کو پیش کر دیا۔ اس فارمولا پر دستخط کرنے والوں میں (مرحوم) مودودی صاحب بھی تھے اور جماعت اہلِ حدیث کے نمائندہ (مرحوم مولانا محمد اسماعیل سلفی) بھی ..... ان دونوں میں بحث چھڑی کہ سنّت کہتے کسے ہیں؟ اس بحث کی تفصیل، جماعتِ اہلِ حدیث کے شائع کردہ کتابچہ — جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث — میں ملے گی۔ سنّت کی (DEFINITION) میں ان کے اختلاف کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جس بات کو مولانا سلفی سنّت کہتے تھے، مودودی مرحوم اسے "بدعت اور دین میں تحریف" قرار دیتے تھے، اور جس بات کو مودودی مرحوم سنّت کہتے تھے، مولانا مرحوم کا ارشاد تھا کہ "یہ ہوائی قلعے ہیں جنہیں ہم مسمار کر کے چھوڑیں گے"۔ جب سنّت کی (DEFINITION) کے متعلق اس قدر اختلاف تھا تو (ظاہر ہے کہ) سنّت کا کوئی متفق علیہ مجموعہ بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے اس کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکتا تھا؟ بیس برس کے بعد، مودودی مرحوم کو اعلان کرنا پڑا کہ "کتاب و سنّت" کی رو سے کوئی ضابطۂ قوانین ایسا نہیں بن سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ پوچھا گیا کہ پھر اس مشکل کا حل کیا ہے؟ فرمایا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے، حالانکہ اس فقہ (بلکہ ہر فقہ) کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ

(۱) اس نے اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

(۲) میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میرا

ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔
(رسائل و مسائل۔ حصہ دوم)

(۳) نہ میں مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں، اور نہ حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل)

(۴) میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ۔ بلکہ اس سے بھی شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اوّل)

(۵) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔
(تنقیحات)

یہ ہے وہ فقہ جسے غیر متبدل، ابدی، اسلامی قوانین کی حیثیت سے یہاں نافذ کیا جا رہا ہے، اور اس وقت تک اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

(۰)

ہم ان حضرات کی خدمت میں گذارش کریں گے جو پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین اور تنفیذ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں کہ یہ ذمہ داری جو آپ نے اپنے سر پر لے رکھی ہے، بڑی نازک اور عظیم ہے۔ سیکولر قوانین کی تدوین اور تنفیذ کے سلسلہ میں مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں کسی قانون کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی خارجی معیار نہیں ہوتا۔ قوانین سازی کے جو طریق دستور کی رُو سے طے ہوں، جو قوانین اس کے مطابق مرتب ہوں انہیں صحیح کہا جائے گا۔ جو اس کے خلاف ہوں، انہیں غلط۔ اگر کوئی قانون غلط مرتب ہو گیا ہے تو دستوری طریق کے مطابق اس کی اصلاح کر لی جا سکتی ہے۔ اس میں جوابدہی بھی پارلیمان یا (زیادہ سے زیادہ) سربراہِ مملکت تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی قوانین کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں، کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے، ایک مستقل، غیر متبدل خارجی معیار ہوتا ہے، جو اس خدا کا متعین فرمودہ ہے جس نے اسلام کو بطور نظامِ زندگی منتخب کیا ہے۔ کسی کی ہزار نیک نیتی بھی کسی غیر اسلامی قانون کو اسلامی نہیں بنا سکتی۔ پھر اس کی جوابدہی بھی بارگاہِ خداوندی میں ہوتی ہے جس کا سلسلہ دراز اس دنیا سے شروع ہو کر اخروی زندگی تک پہنچتا ہے۔ وہاں آپ یہ کہہ کر نہیں چھوٹ جائیں گے کہ ہم نے اس قانون کو نہایت نیک نیتی سے اسلامی سمجھا تھا۔ یا یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل یا کسی شرعی عدالت نے اسے اسلامی قرار دیا تھا۔ جواب دہی، ان قوانین کو نافذ کرنے والوں کی ذاتی ہوگی اور یہ بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکے گا۔ اس میں تو سب سے پہلے یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ جو حکومت ان قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کر رہی ہے، وہ اس خارجی معیار کے مطابق، خود بھی اسلامی ہے یا نہیں۔ کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے اسلامی قوانین نافذ ہو نہیں سکتے۔ (مثلاً) اگر بھارت میں

شراب کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے تو اس کے اس قانون کو اسلامی نہیں کہا جائے گا۔ حالانکہ اس کے مطابقِ اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے اپنے احکام کے نفاذ کے لئے جماعتِ مومنین کی اپنی آزاد مملکت کے قیام کو لاینفک قرار دیا ہے۔ اسلامی مملکت کے قیام سے درحقیقت ایک ایسا نظام قائم یا ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جو منشاءِ خداوندی کو پورا کرتی ہے۔ احکامِ خداوندی اس فضا میں نفاذ پذیر ہونے سے اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ ان قوانین کو غیر اسلامی فضا میں، میکانکی طور پر نافذ کرنے سے وہ مقصد حاصل ہو نہیں سکتا۔ اس مقصد کی دو بنیادی خصوصیات ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں کوئی فرد اپنے رزق کے لئے کسی انسان کا محتاج یا رہینِ منّت نہیں ہوتا۔ اس میں، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا، مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں کوئی فرد کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ تمام افراد احکامِ خداوندی کے پابند ہوتے ہیں۔ اس طرح اس فضا میں ہر فرد کی عزّتِ نفس محفوظ ہوتی ہے۔ کوئی کسی کو ذلت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔

غیر اسلامی قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے، کہ لوگ انہیں اسلامی سمجھ کر ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس سے وہ جس گمراہی کا شکار ہوتے ہیں، اس کی ذمہ داری بھی ان کے سر پر عائد ہوتی ہے جو انہیں اسلامی کہہ کر نافذ کرتے ہیں۔ ان کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے کہ لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ (۱۶/۲۵) " وہ اپنے جرائم کا بوجھ بھی پورا پورا اٹھائے ہوں گے اور اس کے ساتھ ان لوگوں کے بوجھ میں سے بھی جنہیں انہوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہو گا۔ سوچو کہ یہ بوجھ کس قدر استخواں شکن ہو گا " قوانین کو اسلامی کہہ کر نافذ کرنے والوں کو سوچنا ہو گا کہ کہیں وہ تو اس جرم کا ارتکاب نہیں کر رہے؟

وہ خارجی معیار جس کے مطابق کوئی قانون اسلامی یا غیر اسلامی قرار پاتا ہے، خود خدا کا مقرر کردہ ہے۔ ابدی ہے اور غیر متبدّل۔ اور وہ یہ ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو قانون خدا کی کتاب (قرآن) کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں، وہ اسلامی نہیں۔ کافرانہ ہے۔

خدا نے بس یہی ایک معیار مقرر فرمایا ہے۔ اس کے سوا اس نے کوئی اور معیار مقرر نہیں فرمایا۔ اس معیار کا انکار کفر ہے اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو بھی معیار سمجھنا شرک۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰) " خدا کے سوا کسی کو فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کو صاحبِ اقتدار نہ سمجھو۔ یہی محکم اسلامی نظام (الدّین) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

——— (٥) ———

قرآنک کالج

طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۱ء و دسمبر ۱۹۸۱ء میں، سیکرٹری احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی نے بتایا تھا کہ کوآپریٹو سوسائٹی اور قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے لئے اراضی کی مالکانہ دستاویزات حاصل کرنے کے سلسلہ میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ یہ دستاویزات مل تو گئی تھیں لیکن ان میں کچھ اسقام باقی تھے جنہیں دُور کرانے میں کچھ اور وقت لگ گیا۔ اس کے بعد (L.D.A) سے پلان منظور کرانے کا مرحلہ احباب سوسائٹی کے پیشِ نظر ہے۔

(۲) قرآنک کالج کے قیام کے سلسلہ میں جو تاخیر ہوئی ہے وہ ان احباب پر کس قدر گراں گذری ہے جنہیں اس سکیم سے وابستگی ہے، اس کا مجھے پورا پورا احساس ہے۔ لیکن اس سے جو خود میرے دل پہ گذری ہے (اور گذر رہی ہے) اس کا کما حقہٗ احساس بہت کم احباب کو ہوگا۔ لیکن یہ تاخیر ناگزیر تھی۔ اگر حصولِ اراضی میں تاخیر نہ بھی ہوتی تو بھی یہ کالج قائم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز اس سکیم کا قدم اوّل ہی اٹھایا گیا تھا کہ، (اس زمانے کی) حکومت کی طرف سے ستمبر ۱۹۷۲ء میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۸ جاری ہو گیا جس کی رُو سے تمام اسکولوں اور کالجوں کو مع اُن کی املاک اور مقبوضات حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا اور جدید اسکول اور کالج کھولنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس تمام دوران یہ انتظار رہا کہ یہ پابندی امروز فردا میں اٹھا دی جائے گی۔ کچھ عرصہ پہلے اسکولوں پر سے تو پابندی اٹھا دی گئی، لیکن کالجوں پر پابندی بدستور قائم ہے۔ سنا یہی جا رہا ہے کہ یہ پابندی بھی اٹھ جائے گی، لیکن جب تک ایسا نہ ہو، کسی نئے کالج کے کھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس پابندی کے اٹھ جانے کے بعد بھی قرآنک کالج کی سکیم پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ اس دس سال کے عرصہ میں حالات بدل چکے ہیں اور معلوم نہیں اس کے بعد اور کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ ہمارا تو معاشرہ ہی کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ ہمیں کچھ وقت اور انتظار کرنا ہوگا۔

(۳) احباب نے اس سلسلہ میں جو عطیات دیئے تھے وہ میرے پاس بطور امانت محفوظ ہیں۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے ان کی باقاعدہ رسیدیں جاری کی گئی ہیں اور ان کی فہرستیں طلوعِ اسلام میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ جملہ رقوم بینک میں جمع ہیں اور میں نے اس میں سے ایک پائی بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کی۔ قرآنک سوسائٹی کا حساب باقاعدہ آڈٹ کرایا جاتا ہے۔ اس آڈٹ کے بعد میرے سامنے وہ آڈٹ بھی ہے جو مرنے کے بعد ہوگا۔ اس میں تو "نگاہ کی خیانتوں" تک کا بھی مؤاخذہ ہوگا۔

والسلام

پرویز

نئے پمفلٹ: اس شمارہ میں جو دو نئے مقالات شائع ہو رہے ہیں۔ یعنی (۱) "مرض، تشخیص اور علاج"۔ اور (۲) "عورت۔ قرآن کے آئینے میں"۔ ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے الگ الگ پمفلٹ بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان کی قیمت دو (۲) روپے فی پمفلٹ رکھی گئی ہے۔ اگر آپ ان کی عام تقسیم کرنا چاہتے ہوں تو ادارہ کو لکھئے۔ قیمت میں رعایت کر دی جائے گی۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور)

باسمہٖ تعالیٰ

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا مفہوم کیا ہے!

مرض — تشخیص — اور — علاج

ایک جامع مقالہ جس سے اسلامی
حکومت کا تصوّر اور نقشہ نکھر
کر سامنے آجاتا ہے

پرویز

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کورِ نگاہی!

مرض — تشخیص — اور علاج

پرویز

آج میں جس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں، وہ جس قدر اہم ہے، اسی قدر (بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ) نازک بھی ہے۔ اس لئے جو حضرات مطمئن ہیں کہ ہمارا مرّوجہ اسلام بالکل صحیح ہے۔ اس میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے، نہ اصلاح کی گنجائش ——— کمی صرف اتنی ہے کہ لوگ اس پر عمل نہیں کر رہے۔ تو یہ حضرات میری ان گذارشات کا مطالعہ کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اس سے انہیں کسی قسم کا فائدہ پہنچنا تو کجا، الٹی کوفت ہوگی۔ اور میں ایسا قطعاً نہیں چاہتا۔ اس سفر میں میرے ہم رکاب وہی حضرات ہوں جو سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا مرّوجہ اسلام وہ دین نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے حضورؐ نبی اکرم نے متمکّن فرمایا تھا ——— وہ احباب جو اس حقیقت سے متفق ہیں کہ ہماری خرابیوں اور تباہیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم نے مرّوجہ اسلام کو حقیقی دین سمجھ رکھا ہے۔ اور اس کے بعد اس کے متمنّی اور متلاشی کہ وہ حقیقی اسلام کیا تھا اور اس کے دوبارہ متمکّن ہونے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ وہی میرے ہم عنان ہو سکتے ہیں۔ کہ ؎

زمرغانِ چمن ناآشنایم — بشاخِ آشیاں تنہا سرایم
اگر نازک دلی ازمن کراں گیر — کہ خونم می تراود از نوایم
(اقبالؒ)

———(۰)———

آپ صدرِ اسلام کے مختصر سے عرصہ سے آگے بڑھئے تو آپ کو ہماری صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ، ہمارے باہمی انتشار و خلفشار، اور افتراق و اختلاف کی حدیثِ خونچکاں دکھائی دے گی۔ اس اختلاف و انتشار سے اس وقت میری مراد سیاسی اختلاف نہیں۔ سرِدست میری مراد مذہبی یا شرعی اختلافات سے ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ بھی ہمارے (صدیوں سے چلے آنے والے) مرّوجہ اسلام کا کرشمہ ہے جس سے ہمارے

ہمارے اختلافات

سیاسی اور شرعی اختلافات الگ الگ شعبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ حقیقی اسلام میں اس تقسیم و تفریق کا بھی کوئی تصوّر نہیں۔ بہرحال، زیرِ نظر مقالہ میں میرا مرکزی موضوع شرعی اختلافات ہی ہیں جن کی وجہ سے ہم (جنگ تو ایک طرف) امن کے زمانہ میں بھی اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی نے ان جگر پاش اختلافات کا سبب یا اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی ہے؟

(۲) اگر کی ہے تو وہ کس نتیجہ پر پہنچے۔ یعنی ان کی تشخیص کیا تھی؟
(۳) اور تشخیص کے بعد کیا اس کا علاج سوچا گیا؟

اس کے بعد لامحالہ یہی کہنا پڑیگا کہ یا تو کسی نے اس مہلک مرض کی تشخیص کی طرف توجہ نہیں کی۔
(۲) اگر تشخیص کی کوشش کی تھی تو یا تو وہ تشخیص غلط تھی۔ یا علاج صحیح نہیں تھا۔
(۳) اور اگر تشخیص اور علاج دونوں صحیح تھے تو وہ علاج کیا ہی نہیں گیا۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا، بلکہ وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ چنانچہ اب اس کی عالمگیریت کی یہ کیفیت ہے کہ ہر جگہ اس کی شکایت ہوتی ہے لیکن علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جس طرح یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ مرض لاعلاج ہے مریض پر وہ مایوسی چھا جاتی ہے جسے "سکونِ قبل از مرگ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح تشتت و افتراق کے اس مزمن مرض کو اب زندگی کا معمول سمجھ کر گوارا کر لیا گیا ہے۔

(۰)

میری قریب قریب تمام عمر، قرآنِ کریم پر غور و تدبر اور امت کے احوال و کوائف کے مطالعہ میں گذری ہے۔ اور اب میں زندگی کے اس مرحلہ پر پہنچ رہا ہوں جہاں اگلا کنارہ، پچھلے کنارے کے مقابلہ میں قریب تر ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں اپنی عمر بھر کے غور و تدبر کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، اور جس کا میں جستہ جستہ اظہار کئے چلا آ رہا ہوں اسے جامع طور پر قوم کے سامنے پیش کر دوں۔ ہو سکتا ہے کہ دیدہ ورانِ قوم جو اس سے متفق ہوں، اس کے علاج کی طرف توجہ مبذول کریں، یا (کم از کم) آنے والے اربابِ فکر و نظر اس سے استفادہ کر سکیں۔

میں اسے بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ:

(۱) میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ میں (ارشادِ باری تعالیٰ اور اعلانِ حضورؐ نبی اکرم کے مطابق) صرف مسلم ہوں۔ قرآنِ کریم کی ابدیت اور نبوتِ حضورؐ نبی اکرم کی خاتمیت پر میرا ایمان ہے۔
(۲) جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس سے میرا مقصد کسی کے عقیدہ یا مسلک پر تنقید یا تنقیص نہیں۔
(۳) نہ ہی اس سے مقصود بحث و تمحیص ہے۔

میں اپنے حاصلِ تدبر کو نہایت غیر جانبدارانہ انداز سے، خارجی طور پر (OBJECTIVELY) پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ جو اس سے اختلاف کریں، وہ اسے مسترد کر دیں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری تحقیق و تشخیص کا مدار "دین" کے حقائق پر ہے۔ اور ہماری (موجودہ) قوم کا تعلق "مذہبِ اسلام" سے ہے۔ اور یہی اصل مشکل ہے۔ دین، اپنے دعاوی کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی بناء پر پیش کرتا ہے اور فریقِ مخالف سے بھی دلائل ہی کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن مذہب کا تعلق سراسر جذبات سے ہوتا ہے، جسے عام الفاظ میں عقیدت مندی کہا جاتا ہے۔ اور عقیدت، اصولوں سے نہیں، شخصیتوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ آپ کسی اصول یا نظریہ سے اختلاف کریں گے تو فریق

مخالف کے جذبات بہت کم مشتعل ہوں گے لیکن اگر اس گفتگو کے دوران کسی ایسی شخصیت کا ذکر آجائے جس سے اس کی عقیدت وابستہ ہے تو وہ مرنے مارنے پر اتر آئے گا۔ تلاشِ حقیقت کے راستے میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھے خاردار وادیوں سے گذرنا ہوگا۔ جس عقیدہ یا مسلک کے سلسلہ میں بات ہوگی وہ کسی نہ کسی شخصیت کی طرف منسوب ہوگا۔ اس لئے ہزار احتیاط کے باوجود، شخصیتوں کا درمیان میں آجانا ناگزیر ہوگا۔ بقول غالب: ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس سلسلہ میں، مَیں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے — غیر مذاہب کی کسی ایسی شخصیت کے خلاف جسے وہ واجب الاحترام قرار دیتے ہوں، کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ان لوگوں کے لئے دلآزاری کا باعث ہو، چہ جائیکہ میں خود اپنے ہاں کی واجب التعزیر شخصیتوں کے خلاف کوئی ایسی بات کہوں۔ خیال صرف اتنا رہے کہ جب میں کسی نظریہ یا مسلک پر تنقید کروں تو جن شخصیتوں کی طرف وہ منسوب ہو، اسے ان کی تحقیر پر محمول نہ کیا جائے۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد، اصل موضوع کی طرف آیئے۔

(۰)

(۱) اُمّتِ واحدہ

آپ کسی مسلمان سے پوچھئے، خواہ اس کا تعلق کسی فرقے سے ہو، وہ اس سے متفق ہوگا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم مؤرخین بھی اس کی تصدیق کریں گے کہ حضورؐ نبی اکرم کے عہدِ ہمایوں میں، مسلمانوں میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ سب ایک اُمّت کے افراد تھے۔ مذہب کا تعلق پوجا پاٹ۔ بھگتی اور پرستش کے طور طریق یا اخلاقیات کے پند و نصائح سے ہوتا ہے جن پر ہر فرد، اپنے اپنے طور پر عمل پیرا ہو سکتا ہے۔ لیکن دین، نظامِ زندگی کا نام ہے جس کے لئے اجتماعیت بنیادی شرط ہے۔ اس لئے قرآن نے ایک اُمّت کی تشکیل کی تھی۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ... (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمّت بنایا۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو، اور تمہارا رسولؐ تمہارے اعمال کا نگراں ہو۔ دوسری جگہ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ... (۳/۱۱۰)

تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو معروف کا حکم دو اور انہیں منکر سے روکو۔ اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ معروف و منکر کا تعین خود خدا نے کر دیا ہے۔

(۲) وحدت کیسے پیدا ہوتی ہے

سوال یہ ہے کہ افراد میں وحدت کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ اسے ایک مثال سے سمجھئے جو ہر روز ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے۔ آپ کسی شاہراہ پر دیکھئے۔ اس پر مختلف سواریاں ـــــ موٹر کاریں۔ رکشائیں۔ موٹر سائیکل۔ عوامی سائیکل وغیرہ مختلف سمتوں میں رواں دواں آجا رہے ہوں گے ـــــ کوئی دائیں کو، کوئی بائیں کو، کوئی سامنے کی طرف، کوئی پیچھے کی۔ ان میں کہیں یکسانیت دکھائی نہیں دے گی۔ لیکن جونہی وہ اس گول دائرے پر پہنچیں گے جو مختلف سڑکوں کے جائے اتصال پر بنا ہو، ان میں سے ہر ایک بائیں کی طرف مڑ جائے گا۔ ان سب میں سمت کی وحدت پیدا ہو جائے گی۔

یہ وحدت کس طرح پیدا ہو گئی؟ اس طرح جس مملکت کے یہ باشندے ہیں، اس کا قانون ہے۔ بائیں طرف چلو۔ اس قانون کی پابندی سے ان میں وحدتِ سمت پیدا ہو گئی۔

لہٰذا، افراد میں وحدت پیدا کرنے کے لیے ایسے قانون کی موجودگی ضروری ہے جس کا تمام افراد پر یکساں اطلاق ہو۔

لیکن تنہا قانون کافی نہیں۔ اس کے لئے اس اتھارٹی کی بھی ضرورت ہے جو اسے نافذ کرے۔ اسے ہیئتِ حاکمہ (یا نظامِ حکومت) کہا جاتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جس چوراہے یا گول دائرے کی ہم نے اوپر مثال دی ہے، وہاں ٹریفک کا ایک سپاہی کھڑا ہوتا ہے جو اس پر نگاہ رکھتا ہے کہ اس قانون کی پابندی ہو رہی ہے۔

اس اتھارٹی کی اہمیت ایک اور مثال سے، زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آئے گی۔ آپ بادشاہی مسجد میں دیکھئے۔ لاکھوں کا مجمع، نمازِ جمعہ کے لئے بیٹھا ہے۔ جماعت کھڑی ہو جاتی ہے۔ امام کی ایک آواز پر یہ سب کبھی جھک جاتے ہیں۔ کبھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کبھی بیٹھ جاتے ہیں۔ آخر سلام پھیر دیتے ہیں۔ لاکھوں کے اجتماع میں اس قسم کی وحدت کی مثال بہت کم ملے گی۔

باجماعت فرض پڑھ لینے کے بعد، صحنِ مسجد پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے۔ وہی نماز ہے۔ وہی اس کی رکعتیں۔ وہی رکوع، وہی سجود، وہی قعود۔ لیکن کوئی کھڑا ہے۔ کوئی رکوع میں۔ کوئی سجدے میں۔ کوئی قعدہ میں۔ کوئی دعا مانگ رہا ہے، کوئی جوتا اٹھائے باہر جا رہا ہے۔ مسجد بھی وہی ہے اور نمازی بھی وہی۔ لیکن ان کی وہ وحدت گم ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ اختلاف ہی اختلاف ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ ایک امام کے نہ ہونے سے۔

لہٰذا، اُمّت میں وحدت کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) ایک قانون ہو جس کی سب اطاعت کریں ـــــ اور

(۲) ایسی اتھارٹی ہو جو اس قانون کو نافذ کرے اور اس کی پابندی کرائے۔

(۳) عدالت

آپ کسی کچہری میں جا نکلئے۔ وہاں سینکڑوں افراد مصروفِ تگ و تاز نظر آئیں گے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جن میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور انہوں نے اس کے تصفیہ کے لئے عدالت کی طرف رجوع کیا ہے۔ عدالت ان میں قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی اور ان کا اختلاف مٹ جائے گا۔

ظاہر ہے کہ جس قانون کے مطابق عدالت نے فیصلہ دینا ہے، اس سے یہ لوگ (فریقین) واقف ہیں۔ اگر یہ خود واقف نہیں تو وکلا موجود ہیں جنہیں ان قوانین کا علم ہے، لیکن یہ وکلا ان کے تنازعہ (مقدمہ) کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وہ ایسا کرنے کے مجاز نہیں۔ ان کا فیصلہ قانون کی نظروں میں قابلِ قبول نہیں ہوگا خواہ وہ وہی فیصلہ کیوں نہ ہو جو عدالت دے گی۔ اس سے واضح ہے کہ اختلافات مٹانے اور وحدت پیدا کرنے کے لئے تین عناصر لابنفک ہیں۔ یعنی (۱) قانون۔ (۲) قوتِ نافذہ یا مرکزی اتھارٹی۔ اور (۳) عدالت۔

(۰)

(۴) قانون شکنی اور بغاوت

اگر مملکت کا کوئی فرد، کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے۔ اسے جرم اور اس کی سزا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص پاکستان میں رہتے ہوئے بھارت کے قانون کو اتھارٹی تسلیم کرتا ہے تو اُسے حکومتِ پاکستان کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔ بغاوت کے معنی یہ ہیں کہ وہ مملکتِ پاکستان کے ہم دوش ایک اور مملکت قائم کرتا ہے۔ اسے کوئی مملکت بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ نہ ہی وہ اسے برداشت کرے گی کہ کوئی فرد (یا جماعت) اس مملکت کے اندر رہتے ہوئے، قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اسے بھی اس مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

(۰)

ہم نے وحدتِ اُمت اور دین کے نظام کو سمجھانے کے لئے دورِ حاضر کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس لئے کہ جب اسلام کے صدرِ اوّل میں، دین کا نظام قائم ہوا تھا تو اس قسم کی اصطلاحات رائج نہیں تھیں، اور جن الفاظ میں اس نے اپنے نظام کو سمجھایا ہے ان کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جبتک انہیں دورِ حاضر کی اصطلاحات کے تقابل یا تناظر میں سامنے نہ لایا جائے۔ مثلاً قرآن کریم میں، نہ کہیں قانون کا لفظ آیا ہے نہ نظام کا۔ نہ مملکت کا نہ عدالت کا۔ نہ مرکزی اتھارٹی کا، نہ ہیئتِ حاکمہ کا۔ ان کے لئے اس کے اپنے الفاظ ہیں، اور جب تک ان الفاظ کا مفہوم، مروّجہ نظامِ سیاست و اسلوبِ حکومت کی روشنی میں سامنے نہ آئے، دین کے نظامِ حیات کا تصوّر سامنے نہیں آسکتا، بالخصوص جب وہ نظام دنیا

میں کہیں موجود نہیں، اور اس کی جگہ مذہب (یعنی مروّجہ اسلام) نے لے رکھی ہے جس کا اس نظام سے کوئی تعلق نہیں۔

الٰہ۔ عبادت۔ کلمات اللہ

قرآن کریم میں حاکم یا صاحبِ اقتدار کے لئے اِلٰہ کا لفظ آیا ہے۔ محکومیت کے لئے عبادت یا عبدیت کا۔ اور قوانین کے لئے کلمات اللہ یا حدود اللہ کا۔ اس کے نظام کی امتیازی خصوصیت یا انفرادیت اس میں ہے کہ اس میں حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خواہ اس کی کچھ بھی پوزیشن کیوں نہ ہو۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اس کی حیثیت مقننہ کی ہو اور خواہ انتظامیہ کی، (اسے کتاب حاصل ہو، خواہ حکم) حتّیٰ کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں میرے محکوم بن جاؤ۔

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ... (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کی جائے۔ ..... اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ..... (۱۲/۴۰) "یہی محکم دین (نظام) ہے جسے خدا نے عطا فرمایا ہے"..... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ..... (۱۲/۴۰)

شرک

ہم نے پہلے بتایا ہے کہ کسی مملکت میں رہتے ہوئے، کسی دوسری مملکت کے قانون کو اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنا بغاوت کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے شرک کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ جب اس نے کہا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ..... (۶/۵۷) تو اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا کہ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ..... (۱۸/۲۶) "وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔" (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ قانون سازی یا حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں دیتا۔ حتّیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ اسی لئے اس نے خدا کی محکومیت اختیار کرنے والوں سے کہہ دیا کہ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۲۸/۸۷) "دیکھنا! تم کہیں شرک نہ کرنے لگ جانا"۔ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ... "خدا کے ساتھ کسی اور کو صاحبِ اقتدار تسلیم نہ کر لینا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ..... (۲۸/۸۸) اقتدارِ مطلق اور حکومت اسی کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں — لَهُ الْحُكْمُ ..... (۲۸/۸۸) "حکومت اسی کے لئے مختص اور مخصوص ہے"۔ خدا کا عبد (محکوم) وہی ہو سکتا ہے جو لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ..... (۱۸/۱۱۰) "اپنے رب کی محکومیت میں کسی کو شریک نہ کرے۔"

ضابطۂ قوانین

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ خدا کی حکومت، کسی ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں کہ وہ جو جی چاہے حکم دے دے، اس کی اطاعت لازم آئے گی۔ اس نے کہا کہ حکمرانی قانون کی ہوگی، اور خدا نے اپنی حکمرانی کے لئے ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے جسے قرآنِ مجید کہا جاتا ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین، رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملا تھا، لیکن اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ ان قوانین کا اطلاق خود رسول اللہ پر بھی اسی طرح ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں پر۔ واضح رہے کہ کسی مملکت کے قوانین کا اطلاق انہی لوگوں پر ہو سکتا ہے جو اس مملکت کے حقِ اقتدار کو تسلیم کریں۔ مملکتِ خداوندی کے حقِ اقتدار کو تسلیم کرنے کو "خدا پر ایمان لانا" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ خدا پر ایمان لانا خود رسول کے لئے بھی ضروری تھا۔ فرمایا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔۔۔ (۲/۲۸۵؛ ۴۲/۱۵) "جو کچھ خدا نے رسول پر نازل کیا ہے، خود رسول بھی اس پر اسی طرح ایمان لاتا ہے جس طرح دوسرے مومن ۔۔۔۔۔۔۔۔"

(۲) خود رسول بھی اسی ضابطۂ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۔۔۔۔ (۶/۵۰) "ان سے کہو کہ میں خود اسی ضابطۂ قوانین کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری طرف وحی کیا ہے" تا آخر (۷/۲۰۳؛ ۴۶/۹)۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵) "میں اسی کا اتباع کرتا ہوں جسے خدا نے میری طرف نازل کیا ہے۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔"

اس ضابطۂ قوانین کی خصوصیات اس قدر ہیں کہ ان صفحات میں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(ا) خدا نے جو احکام بذریعہ وحی دینے تھے وہ سب اسی کتاب (قرآن) کے اندر منضبط کر دیئے تاکہ لوگوں کو اس کی تلاش نہ کرنی پڑے کہ فلاں قانون کس جگہ ملے گا۔ تمام احکامِ خداوندی اس ایک کتاب کے اندر مذکور ہیں۔ یہی حضور ﷺ کے ہم عصروں کے لئے ضابطۂ ہدایت تھی اور یہی آپ کے بعد آنے والے (قیامت تک کے) انسانوں کے لئے ضابطۂ قوانین ہے: وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ ۔۔۔۔۔۔ (۶/۱۹)

(ب) چونکہ یہ کتاب انسانی فکر کی تخلیق نہیں تھی (خدا کی نازل فرمودہ تھی) اس لئے ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا کہ اس کی مثل قوانین مرتب کر کے دکھاؤ۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲/۲۳) "اگر تمہیں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہو تو اس کی ایک سورت کی مثل مرتب کر کے دکھاؤ۔ اور اپنے ساتھ اپنے ہمنوا ساتھیوں کو بھی شریک کر لو۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ تم اپنے

دعویٰ میں سچے ہو یا جھوٹے"۔

(ج) یہ کتاب اپنی ہر بات کو اس طرح واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ اس کے مطالب کے سمجھنے میں نہ کسی قسم کا ابہام رہتا ہے نہ الجھاؤ۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ..... (۱۶/۸۹) "اور ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر بات کو کھول کھول کر بیان کرتی ہے۔

(د) اس میں کوئی اختلافی بات نہیں: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سی اختلافی باتیں پاتے۔

(س) خدا نے جس قدر احکام و قوانین انسانوں کو دینے تھے، وہ سب اس میں آگئے۔ اس لئے یہ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ اور جو قوانین اس میں دیئے گئے ہیں وہ ایسے محکم ہیں کہ ان میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی کسی کو اس کا حق حاصل ہے کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ..... (۶/۱۱۶ ; ۱۸/۲۷)

تیرے رب کے جملہ قوانین اس کتاب میں، صدق اور عدل کے ساتھ، مکمل ہو گئے۔ انہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں۔

حتیٰ کہ رسول کو بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں تھا: قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗيِٕ نَفْسِيْ ..... (۱۰/۱۵) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ مجھے اس کا اختیار ہی نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر سکوں"۔

(ش) اس کتاب کو ہر اعتبار سے مکمل اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دینے کے بعد اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

ہم ہی نے اسے نازل کیا ہے۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

(ص) اس کے بعد نوعِ انسان سے کہہ دیا کہ یہ کتاب تمہاری راہ نمائی کے لئے کافی ہے ..... اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ..... (۲۹/۵۱) "اے رسول! ان لوگوں سے پوچھو کہ کیا یہ ضابطہ قوانین جسے خدا نے تیری طرف نازل کیا ہے، اور جسے تو نے ان کے سامنے پیش کر دیا ہے (چھپا کر نہیں رکھا) کیا یہ ان کی راہ نمائی کے لئے کافی نہیں"؟

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی اور کو نہیں: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ..... (۱۲/۴۰)۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ..... (۱۲/۴۰) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ..... (۱۲/۴۰) یہی محکم نظامِ زندگی ہے۔ خدا اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸/۲۶)

حکومت

ضابطہ، قوانین کیسا ہی منفرد اور مکمل کیوں نہ ہو، محض پند و نصائح کی کتاب ہے اگر اس کے ساتھ "قوتِ نافذہ" یا حکومت نہ ہو۔ اس کے لئے اللہ تعالےٰ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ ۝ (۲۴/۵۵)

ہم نے ان لوگوں سے، جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں اس زمین میں حکومت عطا کریں گے۔ (۲۴/۵۵) یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے سابقہ اقوام کو بھی اسی قسم کی حکومت عطا کی تھی۔ اس حکومت کا مقصد یہ ہوگا کہ اس دین (نظامِ زندگی) کو استحکام حاصل ہو جائے جسے ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تاکہ وہ نہایت اطمینان اور سکون سے صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کر سکیں اور ان پر کسی کا دباؤ نہ ہو کہ وہ اس کی بھی اطاعت کریں اور اس کے ساتھ کسی اور قانون کی بھی، اور اس طرح شرک کے مرتکب ہو جائیں۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں کیسے عظیم حقائق ایک ہی آیت میں سمو کر رکھ دیئے ہیں۔ یعنی:-

(i) یہ حکومت بزورِ شمشیر حاصل نہیں کی جائے گی۔ یہ "ایمان و اعمالِ صالحہ" کا فطری نتیجہ ہوگی۔

(ii) یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا ایمان اور اعمال قرآنی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں، یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے نتیجہ میں ہمیں اس قسم کی حکومت ملتی ہے یا نہیں۔

(iii) اس حکومت کا مقصد، کمزور انسانوں پر ظلم و استحصال اور سلب و نہب نہیں ہوگا۔ اس کا مقصد دین کا تمکن ہوگا۔

(iv) دین کا تمکن اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔

(v) اس قسم کی حکومت کے بغیر احکامِ خداوندی کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ صدرِ اوّل کی جماعتِ مؤمنین کے متعلق فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں تمکن فی الارض — ملک میں حکومت — حاصل ہوگی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے۔ اور ان کے تمام معاملات آخر الامر قوانینِ خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔

حضورؐ کی حکومت

یہ ضابطۂ حیات اور حکومت عطا ہونے کے بعد حضورؐ سے فرمایا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ ...... (۵/۱۰) "ان میں ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔ اور ان کے معاملات کا فیصلہ اسی کے مطابق کرو"۔ آپؐ نے ان لوگوں سے واضح طور پر کہہ دیا کہ أَفَغَيْرَ اللهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا .... (۶/۱۱۵) "اے میری دعوت کے مخالفو! کیا تم چاہتے ہو کہ میں خدا کو چھوڑ کر کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطۂ قوانین نازل کر دیا ہے جو بڑا مفصّل ہے"۔

قرآن کریم میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے جس قدر احکام آئے ہیں وہ اسی حکومت کے فرائض ہیں۔

عدالت

حکومت کا زیادہ تر تعلق انتظامی معاملات سے ہوتا ہے۔ جہاں تک افراد کے اختلافات کا تعلق ہے، ان کا فیصلہ عدالت کے ذریعے ہوتا ہے۔ حضورؐ کا یہی منصب تھا جس کے متعلق فرمایا کہ

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)

خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے اختلافی معاملات میں تمہیں حکم (فیصلہ کرنے والا) نہ بنائیں۔ اور جو فیصلہ تم صادر کرو اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم نہ کریں کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔

اس عدالت کی طرف رجوع کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جائے۔ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ ...... (۴۲/۱۰)۔ "جن معاملات میں بھی اختلاف ہو، ان کا فیصلہ خدا (کی کتاب) سے لیا کرو"۔ ظاہر ہے کہ جب فیصلہ اس کتاب کی رُو سے ہوتا تھا جس کی صداقت پر ان کا ایمان تھا، اور اس جج (رسول) کی وساطت سے، جس کی امانت پر بھی ان کا ایمان تھا۔ تو پھر اس فیصلہ کے خلاف دل میں گرانی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی؟ قرآن تو آیا ہی اختلافات مٹانے کے لئے تھا۔ (۱۶/۶۴)۔

کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز

ان تصریحات کے بعد واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہتے ہیں۔

یہ تھا وہ نظام جس نے اُمت میں وحدت پیدا کر دی تھی۔ ایک ضابطہ، قوانین جس کے مطابق اُمت کے تمام انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس کی تاکید اس اُمت کو ان الفاظ میں کر دی گئی تھی کہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۰۳)

تم سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر کتاب اللہ کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا ہونے دو۔ تم ذرا اپنی پچھلی حالت پر غور کرو جب تم اجتماعی زندگی کے بجائے فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور تم میں باہمی عداوت تھی۔ خدا نے اس حالت میں تمہیں ایسا ضابطہ زندگی اور نظامِ حیات عطا کیا جس سے تم میں (ظاہری اتحاد ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ) تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے اور تم آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ تمہارا اس طرح ایک اُمت بن جانا، خدا کا کتنا بڑا انعام تھا۔ تم اس سے پہلے ہلاکت اور تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نظام خداوندی نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ اللہ اس طرح اپنے قوانین و ضوابط اور ان کے نتائج و ثمرات واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ زندگی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے رہے۔

اعتصام بحبل اللہ

اس آیۂ جلیلہ سے تین اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:۔

(۱) اعتصام (وابستگی) صرف حبل اللہ (کتاب اللہ) کی مطلوب ہے۔ کسی اور چیز کی نہیں۔

(۲) یہ وابستگی (اطاعت) انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی (جمیعاً) ہے۔ اسی ضابطہ، قوانین کی اطاعت میں اُمتِ واحدہ کی تشکیل، استحکام اور بقا کا راز مضمر ہے۔

(۳) اعتصام بحبل اللہ جمیعاً تو مثبت حکم ہے۔ اس کے برعکس تفرقہ سے منع کیا گیا ہے۔

تفرقہ کا مطلب کیا ہے، یہ سمجھنے کی بات ہے۔ اس کے لئے ٹریفک کے چوراہے کی مثال سامنے لائیے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مملکت کے قانون کی اطاعت کرنے والی جماعت بائیں جانب مڑ گئی تھی۔ جو لوگ (اس قانون کے برعکس) کسی اور قانون کی اطاعت کرنا چاہتے تھے، وہ ان سے الگ ہو کر دائیں جانب مڑ گئے۔ اسے (یعنی الگ ہو جانے کو) تفرقہ کہتے ہیں، اور اس طرح الگ ہو جانے والوں کو فرقہ۔

شرک کے عنوان کو ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت کرنا، شرک ہے ——— یہ اطاعت کسی اور مملکت کے قانون کی ہو، یا خود اپنا فیصلہ، ان

میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے کسی کی اطاعت بھی ہو، وہ شرک کے زمرہ میں آجاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے — أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُۥ هَوَىٰهُ...... (۴۵/۲۳) "تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا حکمران بنا لیا۔ قانونِ خداوندی کے بجائے، اپنے فیصلوں کا اتباع کرنے لگ گیا"۔ یہ بھی شرک ہے کیونکہ اس سے بھی وہ جماعت (اُمّت) سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی کو تفرقہ کہتے ہیں — اور قرآنِ کریم نے بہ نصِ صریح تفرقہ کو شرک قرار دیا ہے۔ فرمایا:-

...... وَلَا تَكُونُوا۟ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ ٱلَّذِينَ فَرَّقُوا۟ دِينَهُمْ وَكَانُوا۟ شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور ایک الگ فرقہ بن کر بیٹھ گئے"۔

اس فرقہ بندی سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ اس خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے کہ میرا فرقہ حق پر ہے اور باقی سب باطل پر (حالانکہ) جب اُمّت فرقوں میں بٹ جائے تو کوئی فرقہ بھی حق پر نہیں رہتا۔ حق پرستی تو مشروط ہی اُمّت کی وحدت سے ہے۔

اس کے بعد ایک اور حقیقت پر بھی غور کیجئے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، شرک کے معنی اپنی مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغاوت کرنے والوں کا اس مملکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے فرمایا: إِنَّ ٱلَّذِينَ فَرَّقُوا۟ دِينَهُمْ وَكَانُوا۟ شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِى شَىْءٍ ...... (۶/۱۶۰) "جن لوگوں نے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور خود ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اس مملکت کے باغی ہیں"۔

ہمارے ہاں شرک، صرف بت پرستی کو کہا جاتا ہے۔ (میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ اس کا یہ مفہوم کیوں وضع کیا گیا؟) لیکن قرآنِ کریم نے ایک مقام پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بت پرستی بے شک باطل ہے لیکن اس کی بنیاد جہالت ہے۔ حقیقی شرک تفرقہ ہے۔ داستانِ بنی اسرائیل کے ضمن میں ہے کہ جب

حقیقی شرک تفرقہ ہے

حضرت موسیٰؑ کچھ دنوں کے لئے باہر تشریف لے گئے اور قوم کی نگہبانی حضرت ہارونؑ کے سپرد ہوئی، تو قوم نے گئو سالہ پرستی اختیار کر لی۔ حضرت موسےٰؑ واپس تشریف لائے تو سخت برافروختہ ہوئے اور حضرت ہارونؑ سے بڑی سختی اور درشتی کے ساتھ پوچھا کہ یہ کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور تم اطمینان سے بیٹھے رہے، تم نے انہیں اس سے روکا کیوں نہ؟ حضرت ہارونؑ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں انہیں اس سے منع کرتا تو قوم میں پھوٹ پڑ جاتی اور تم مجھ سے ناراض ہو جاتے کہ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ...... (۲۰/۹۴) "تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا"۔ میں نے ان کی بت پرستی کو تو کچھ وقت کے لئے گوارا کر لیا لیکن ان میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس جواب سے حضرت موسےٰؑ مطمئن ہو گئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفرقہ کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ یہ، بت پرستی کے شرک کے مقابلہ میں، کہیں

زیادہ خطرناک شرک ہے۔

اختلاف تفرقہ (فرقہ بندی) سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اسے قرآن نے کفر قرار دیا ہے اور روسیاہی کا موجب بنایا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۳/۱۰۴)

اے جماعتِ مومنین! دیکھنا! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو خدا کی طرف سے واضح راہ نمائی آجانے کے بعد، فرقوں میں بٹ گئے اور آپس میں اختلاف پیدا کر لیا۔ اس کا نتیجہ سخت تباہی کا عذاب ہوگا۔

اگلی آیت میں ہے کہ یہ روش ان کی روسیاہی کا موجب ہوگی۔

(ضمناً) مشاورت میں مختلف آراء اور مختلف خیالات سامنے آئیں گے۔ یہ وہ اختلاف نہیں جس سے منع کیا گیا ہے۔ اختلاف یہ ہے کہ معاملہ زیرِ بحث کے متعلق فیصلہ ہو جانے کے بعد، اس کی مخالفت کر کے ایک الگ ٹولہ بنا لیا جائے۔ جس اختلاف کا نتیجہ، تفرقہ (فرقہ پرستی) ہو، وہ اختلاف کفر ہے اور اس کا نتیجہ (فرقہ بندی) شرک۔

بات واضح ہے کہ جب بھی قرآنِ کریم کے سوا کسی اور قانون حکم۔ فیصلہ کی اطاعت کی جائے گی تو اس سے تفرقہ پیدا ہوگا، اور جب اُمت میں تفرقہ پیدا ہو جائے۔ وہ فرقوں میں بٹ جائے تو پھر اسلام باقی نہیں رہتا! اسلام اور اُمت کی وحدت لازم و ملزوم ہیں۔ اور اُمت کی وحدت نتیجہ ہوتی ہے خالص کتاب اللہ کی اطاعت کا۔

---(٠)---

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسولؐ

کہا جائے گا (اور جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا۔ یہ کہا جاتا ہے) کہ قرآن کریم نے اللہ کی اطاعت اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اگر دین نام ہے خالص اللہ (یعنی کتاب اللہ) کی اطاعت کا، تو رسولؐ کی اطاعت کے حکمِ خداوندی کی تعمیل کس طرح کی جائے گی؟ اس اطاعت کا ذریعہ تو قرآن سے خارج ہی ہوگا۔

یہی "دو اطاعتوں" کا تصور یا عقیدہ، سرچشمہ ہے اس تمام افتراق و اختلاف، اور تشتت و انتشار کا جس میں اُمت ہزار برس سے مبتلا چلی آ رہی ہے۔ یہی ساری بحث کا نقطہ، ماسکہ ہے اور یہی میرے اس

مقالہ کا موضوع ــــ میں نے کافی غور و خوض کے بعد مناسب یہ سمجھا ہے کہ قرآن کی اس اصطلاح کا مفہوم تو یہاں بیان کر دیا جائے اور اس مفہوم کی وضاحت، دلائل اور قرآنی اسناد آخر میں جا کر سامنے لائی جائیں، کیونکہ اس امر کا فیصلہ اسی وضاحت اور سند کے بعد ہوگا کہ ہمارا مروّجہ اسلام، حقیقی اسلام ہے جس میں کسی اصلاح اور تغیّر و تبدّل کی ضرورت نہیں۔ یا حقیقی اسلام کچھ اور ہے۔

نزولِ قرآن کے زمانے میں عربوں کے ہاں منظّم حکومت کا وجود تو ایک طرف، تصوّر تک بھی نہیں تھا۔ قرآن کریم نے منظّم حکومت (یا نظامِ حکمرانی) کا تصوّر ہی نہیں دیا بلکہ اسے دین کی غایت یا منتہیٰ قرار دیا۔ لیکن اس نے جس قسم کی حکومت کا تصوّر دیا وہ دنیا جہاں سے نرالا تھا۔ انبیاءِ سابقہ کے استخلاف فی الارض کا نقشہ تو اسی قسم کا ہوگا لیکن زمانہ نزولِ قرآن میں اس کے آثار تک مٹ چکے تھے۔ جو حکومتیں اُس وقت دنیا میں قائم تھیں، قرآن کا پیش کردہ تصوّر ان سے یکسر مختلف تھا۔ یہ وجہ ہے جو قرآن نے اُن لوگوں کے ہاں کی سیاسی یا حکومتی اصطلاحات کو استعمال نہیں کیا۔ ان لوگوں کے تصوّرِ حکومت میں

منفرد نظامِ حکومت

حکمرانی کسی نہ کسی شکل میں انسانوں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ قرآن کا تصوّر یہ تھا کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل ہی نہیں۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ اس کی کتاب میں مندرج قوانین و احکام ہیں۔ لہٰذا اطاعت صرف خدا (بالفاظِ دیگر خدا کی کتاب) کی جائز ہے۔ اطیعوا اللّٰہ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن کتاب یا اس میں لکھے ہوئے احکام و قوانین تو ساکت و صامت (خاموش) ہوتے ہیں۔ ان کی اطاعت کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اگر اسلام بھی ایک مذہب ہوتا تو ہر شخص ان احکام کی اطاعت اپنے اپنے طور پر کر لیتا۔ لیکن یہ تو الدّین (یعنی ایک اجتماعی نظام) ہے جس میں ان قوانین کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوگی۔ اور یہ چیز ایک منظّم حکومت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ تنہا کتابوں سے یہ ممکن نہیں۔

قرآن نے کہا کہ اس کے لئے بے شک ایک منظّم حکومت کی ضرورت ہے لیکن اس حکومت میں کسی انسان کو قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس حکومت کا فریضہ، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے کس کس قسم کے طریق اور اسلوب اختیار کئے جائیں گے۔ اسے وہ نظام، اُمّت کے باہمی مشورہ سے خود طے کرے گا۔

اس انداز کی حکومت پہلے پہل، حضورؐ نبی اکرم نے قائم فرمائی جس کی مرکزی اتھارٹی وہ خود تھے۔ اس حکومت کا فریضہ، احکام و قوانینِ خداوندی کا نفاذ تھا۔ اور بس۔ اس ضمن میں جو آیات پہلے گزر چکی ہیں، انہیں ایک بار پھر سامنے لائیے۔ ان سے اس نظامِ حکومت کے بنیادی خط و خال واضح ہو جائیں گے۔ یعنی:-

(۱) اس میں کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں تھا، حتّیٰ کہ نبی کو بھی نہیں، کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔

(۲) حکومت کا فریضہ، احکام و قوانینِ خداوندی پر عمل کرانا تھا۔

(۳) حکومت کا سربراہ، سب سے پہلے ان احکام و قوانین کی اطاعت خود کرتا تھا۔

(۴) قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کے تغیر و تبدل، حک و اضافہ یا ترمیم و تنسیخ کا حق کسی کو حاصل نہیں تھا۔

(۵) افرادِ مملکت، ان قوانین کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں کرتے تھے بلکہ حکومت کے نافذ کردہ طریق کے مطابق کرتے تھے۔ بظاہر، یہ اطاعت، نظامِ حکومت کی تھی لیکن درحقیقت یہ اطاعت خدا کی اطاعت تھی۔

اس قسم کے نظامِ حکومت کے لئے دنیا میں کوئی اصطلاح موجود نہیں تھی۔ قرآن نے اس کے لئے اپنی اصطلاح وضع کی۔ اور وہ اصطلاح تھی۔۔۔ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کی۔ یعنی خدا کی اطاعت، اس نظام کی رُو سے جس کا سربراہ رسولؐ ہے۔ ذیل کی آیت میں اس نظامِ حکومت کا نقشہ ان الفاظ میں مرتب کر دیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (۴/۵۹)

اے جماعتِ مومنین! تم اس نظامِ حکومت کی پوری پوری اطاعت کرو جسے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرانے کے لئے اس کے رسول نے قائم کیا ہے۔ اس کا تنظیمی نقشہ یہ ہے کہ اس کی ایک مرکزی حکومت ہے اور اس کے ماتحت، افسرانِ مجاز۔ ان افسروں کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ایسا ہو کہ تم میں اور ان ماتحت افسروں میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اس کے لئے مرکزی حکومت کی طرف رجوع کرو۔ یہ شہادت ہو گی اس امر کی کہ تم واقعی خدا کے ضابطۂ قوانین اور مکافاتِ عمل پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ روش نہایت عمدہ اور مآل کار معاشرہ کا توازن برقرار رکھنے کا موجب ہو گی۔

اس میں "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" سے مراد اس نظام کی مرکزی حکومت ہے اور اولی الامر سے مراد، افسرانِ ماتحت۔ ان افسروں کے فیصلہ کے خلاف، مرکزی حکومت میں اپیل دائر کی جا سکے گی لیکن اس حکومت کا فیصلہ حرفِ آخر ہو گا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس مفہوم کی قرآنی اسناد اور تائیدات، آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔ یہاں صرف اتنی وضاحت کافی ہو گی کہ اگر "اطیعوا الرسول" سے مراد، رسول اللہؐ کی ذات کی اطاعت لی جائے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نظام کو حضورؐ کی ارضی حیات تک ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ختم ہو جانا تھا۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا دعویٰ ہے کہ اسلام، تمام نوعِ انسان کے لئے آخری اور مکمل دین ہے، اس لئے اسے حضورؐ کی وفات کے بعد بھی باقی رہنا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن نے خود ہی (یہ کہہ کر) وضاحت کر دی کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کا رسولؐ ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی رسولؐ آئے اور (اپنی مدت حیات پوری کرنے کے بعد) دنیا سے چلے گئے۔ سو اگر یہ رسولؐ بھی کل کو وفات پا جائے، یا قتل کر دیا جائے، تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین تو حضورؐ کی زندگی تک محدود تھا۔ جب آپؐ دنیا میں نہ رہے تو دین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا) اپنی زمانہ قبل از اسلام کی روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو ایسا کرے گا وہ (اپنا ہی نقصان کرے گا) اللہ کا اس سے کچھ نہیں بگڑے گا۔ (ان کے برعکس) جو لوگ اس نظام پر قائم رہیں گے انہیں اس کا اجر ملتا رہے گا۔

حضورؐ کے بعد

یعنی یہ نظام، حضورؐ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح قائم رہے گا اور آگے چلے گا۔ اور "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی عملی شکل اس نظام کی اطاعت ہو گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے، حضورؐ کی وفات پر، جب جماعتِ مومنین میں کہرام مچ رہا تھا، ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

ایہا النّاس من کان یعبد محمداً فانہ قد مات ومن کان یعبد اللہ فانہ حی لا یموت۔

اے لوگو! جو شخص محمدؐ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا وہ جان لے کہ اس کا حاکم وفات پا گیا ہے۔ لیکن جو اللہ کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھا تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ زندہ ہے۔ اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

اللہ کے ہمیشہ زندہ رہنے سے مراد یہ تھی کہ اس کی کتاب محفوظ ہے جو ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حکومت رہے گی۔ اس کی عملی شکل کے متعلق خود رسول اللہؐ نے فرما دیا تھا کہ

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔
(مشکوٰۃ - باب اعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریق کا اتباع لازم ہے اور (میرے بعد) میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کا جو خدا کی راہ نمائی میں خود بھی چلتے رہیں گے اور تمہیں بھی چلائیں گے۔

حضورؐ کے بعد ——— "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" ——— کا عملی مفہوم اسی نظام کی اطاعت تھی جو حضورؐ کے سچے جانشینوں کے ہاتھوں قائم رہا۔ اسی کو دیگر متعدد روایات میں "تمسک بالجماعت اور اطاعتِ امیر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

———(○)———

اس کے بعد

حضورؐ کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہ نظامِ حکومت قائم رہا۔ اور "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کے فریضہ کی ادائیگی میں نہ کوئی عملی دشواری پیش آئی، اور نہ ہی اس کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی ذہنی اُلجھاؤ پیدا ہوا۔

اس کے بعد، اس نظام کی جگہ ملوکیت آگئی جس میں "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی جگہ انسانوں کی حکومت نے لے لی۔ اس سے نہ وہ نظام باقی رہا نہ اس کی مرکزیت۔ نہ جماعت رہی نہ اس کی وحدت۔ دین، سیاست سے الگ ہو کر مذہب بن گیا، اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی قرآن کی اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اب الٰہ کے معنی ہو گئے۔ "وہ جس کی پرستش کی جائے"۔ عبادت کے معنی ہو گئے "پرستش۔ پوجا"۔ توحید کے معنی ہو گئے یہ ماننا کہ "خدا ایک ہے"۔ اور شرک کا مفہوم ہو گیا "بت پرستی"۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ، مذہبی شعائر قرار پا گئے جنہیں انفرادی طور پر اور ہر طرح کی حکومت کے تابع ادا کیا جا سکتا ہے۔ خدا کی حکمرانی سے مراد ہو گیا، خارجی کائنات میں اس کی حکومت۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں ایک دقت پیش آئی۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ، تو احکامِ خداوندی تھے۔ ان کی ادائیگی سے "اطیعوا اللہ" کا فریضہ ادا ہو گیا۔ لیکن "اطیعوا الرسول" کا فریضہ کس طرح ادا ہو؟ اس کا ذریعہ کیا ہو؟ اس کے متعلق سوچا یہ گیا کہ یہ اطاعت، نبی اکرمؐ کے ارشاداتؐ کی اطاعت کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں پھر ایک اور دقت پیش آئی۔ قرآنِ مجید تو مدوّن اور مرتّب شکل میں موجود تھا لیکن ارشاداتِ نبویؐ کا کوئی ایسا مجموعہ موجود نہیں تھا۔ نبی اکرمؐ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا۔ یہی نہیں کہ آپؐ نے خود ایسا مجموعہ مرتب نہیں کرایا تھا بلکہ صحابہؓ کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ حضورؐ کے اقوال کو لکھیں نہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہٗ۔

مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا کچھ اور لکھ لیا ہو، وہ اسے مٹا دے۔

مسند امام احمدؒ میں ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا:۔

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہؐ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن رسول اللہؐ، ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا۔ یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم لوگ سنتے ہیں اسے لکھ لیا کرتے ہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب؟ پھر فرمایا، خالص رکھو اللہ کی کتاب کو اور ہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو (صحابہؓ کہتے ہیں کہ) ہم نے جو کچھ لکھا تھا اسے ایک میدان میں اکٹھا کیا اور جلا دیا۔

(بحوالہ تدوینِ حدیث۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم۔ صفحہ ۲۴۹)

چنانچہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں، لاکھوں کے اجتماع میں اعلان فرمایا کہ:

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ۔ کتاب اللہ۔

(صحاح۔ بحوالہ سیرۃ النبی۔ علامہ شبلیؒ: جلد دوم۔ صفحہ ۱۵۶)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد، حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ نبی اکرمؐ نے اُمّت کے لئے کیا چھوڑا ہے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ما بین الدفتین۔ یعنی مجلد قرآنِ کریم۔ یہی حضرت محمد بن حنفیہؓ نے بھی کہا۔ (بخاری۔ کتاب فضائل القرآن۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۴۳)۔

حضورؐ کے بعد، صحابہؓ کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا۔ یعنی انہوں نے بھی، نہ یہ کہ احادیثِ نبویؐ کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کرایا بلکہ جس کے پاس کوئی تحریری نوشتہ موجود تھا اس نے اسے جلا دیا۔ یہ حقیقت ایسی مسلّمہ ہے کہ اس کی تائید میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی، ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ نہایت اہم کتاب۔ مقامِ حدیث میں ملے گی۔ نیز، میری کتاب "شاہکارِ رسالت" کے آخری باب میں۔

اور اس کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر مجموعہ ہائے احادیث موجود ہیں (جو تیسری صدی میں مرتب ہوئے تھے) ان میں، ان سے پہلے کی کسی کتاب کا نہ حوالہ ملتا ہے نہ اقتباس۔

یہ جو واقعہ ہے کہ نہ نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ مرتب ہونے دیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا، تو ایسا سہواً نہیں کیا گیا۔ دانستہ کیا گیا۔ یہ خدا کے پروگرام کے مطابق تھا۔ قرآن کریم مکمل ضابطۂ حیات ہے لیکن اس کی صورت ایسی ہے کہ اس میں (بجز چند احکام) اقدار و اصول دئے گئے ہیں۔ ان

قوانین کی جزئیات

اصولوں کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کیں۔ یہ اس لئے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہنے تھے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق، اور ان قوانین کی جزئیات کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اگر وہ جزئیات بھی قرآنِ کریم کے اندر دے دی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدّل قرار پا جاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال و کوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عمل درآمد مشکل (بلکہ ناممکن) ہو جاتا، تو اُمّت خود نفسِ اسلام ہی سے بدظن ہو جاتی اور خیال کر لیتی کہ اسلام ماضی کے کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھا، لیکن اب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے زمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس سے وہ خود دین ہی کو خیرباد کہہ دیتی۔ قرآنِ کریم نے سورۃ المائدہ کی حسبِ ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا

ہ جیسا کہ پاکستان میں ہوا ہے۔ حکومت نے ہزار برس پہلے کے تعزیری احکام کو اسلامی احکام کہہ کر نافذ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد خود صدرِ مملکت کو اعتراف و اعلان کرنا پڑا کہ ان احکام پر عمل درآمد ناممکن ہے۔ اس سے ہماری نئی نسل کے دل میں نفسِ اسلام کے متعلق طرح طرح کے شکوک اور اعتراضات ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔

بِهَا كٰفِرِيْنَ ۝ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تشریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر (بفرضِ محال) ان امور کو بھی قرآن میں دے دیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دے دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ اور جب تغیرِ حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائے گی تو تمہارے لئے ان کا نباہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم (بنی اسرائیل) نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہوگئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے لبادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہٰذا، جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تو انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت ایک حدیث میں ملتی ہے:-

حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ باتیں فرض قرار دی ہیں۔ تم انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ باتیں حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے کچھ حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ امور کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ تم ان کے متعلق کرید مت کرو کیونکہ خدا نے ایسا بھول کر نہیں کیا۔ دانستہ کیا ہے۔

(مشکوٰۃ - باب اعتصام بکتاب وسنّت)

نبی اکرمؐ نے نظامِ حکومت قائم فرمایا تو قرآن کریم کے اصول و قوانین کی جزئیات بھی خود متعین کیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بھی۔ یہ سب کچھ صحابہؓ کے مشورہ کے ساتھ (کیونکہ ایسا کرنے کا حضورؐ کو حکم دیا گیا تھا ۳/۱۵۹) اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں رہنا تھا۔ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ان میں ردّوبدل ہونا ضروری تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں عہدِ رسالت مآبؐ کی کئی ایک جزئیات میں تبدیلی اور اضافہ کیا گیا۔ (تفصیل میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی)۔ حضورؐ نے اپنے ان ارشادات کو اس لئے مرتب کرنے سے روک دیا کہ اُمّت انہیں غیر متبدل خیال کرلے گی اور اس سے اسی مشکل میں پھنس جائے گی جس کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے خود بھی انہیں مرتب نہ فرمایا اور صحابہؓ کو بھی ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اس سنّتِ نبویؐ کا اتباع کیا اور احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا۔ یہ وجہ تھی جو معینِ حدیث کو اپنے سے پہلے کا مرتب شدہ کوئی مجموعۂ احادیث نہ مل سکا۔ اگر قرآنی نظامِ حکومت، خلافتِ راشدہ کے بعد مسلسل آگے چلتا تو ضابطہ، قوانین بنانے کے لئے ان مجموعوں کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ یہ تو اس نظام کے معدوم ہو جانے کا نتیجہ تھا جو "اطیعوا الرسول" کا مختلف مفہوم ذہنوں میں آیا جس کی وجہ سے اس مقصد کے لئے احادیث کے جمع کرنے کی ضرورت پڑی۔

ان مجموعوں کو کس نے مرتب کیا، اور کس طرح مرتب کیا، یہ داستان بھی غور طلب ہے۔ ویسے تو احادیث کے مجموعے کثرت سے ہیں، لیکن ان میں سے (سُنّیوں کے ہاں) چھ مجموعے مستند سمجھے جاتے ہیں، جنہیں صحاح ستہ

کہا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کے ... چار مجموعے الگ ہیں۔

یہ کس طرح مرتب ہوئے، اس سلسلے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ان (جامعین احادیث) کے پاس کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ لہٰذا، انہوں نے لوگوں سے کہا کہ جس شخص نے رسول اللہؐ کی کوئی روایت کسی سے سنی ہو، وہ ان تک پہنچا دے۔ ان صحاح ستہ میں، مسلم اور بخاری کو صحیحین کہا جاتا ہے، اور ان میں بھی بخاری کو سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ امام بخاریؒ نے کہا ہے کہ اس طرح ان کے پاس قریب چھ لاکھ روایات جمع ہوئیں۔ ان میں سے انہوں نے قریب پانچ لاکھ، ترانوے ہزار کو مسترد کر دیا اور باقی سات ہزار (جنہیں انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا) اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا۔ ان میں سے اگر مکررات کو نکال دیا جائے تو باقی (۲۷۶۲ کے قریب) رہ جاتی ہیں۔ ان ہر شش جامعین کے کوائف حسب ذیل ہیں:۔

نام اور وطن	وفات	کتنی روایات ملیں	کتنی قابل قبول سمجھیں
۱۔ امام بخاریؒ (بخارا)	۲۵۶ھ	چھ لاکھ	۲۷۶۲
۲۔ امام مسلمؒ (نیشاپور)	۲۶۱ھ	تین لاکھ	۴۳۴۸
۳۔ ترمذیؒ (ترمذ)	۲۷۵ھ	تین لاکھ	۳۱۱۵
۴۔ ابوداؤد (سیستان)	۲۷۵ھ	پانچ لاکھ	۴۸۰۰
۵۔ ابن ماجہؒ (قزوین)	۲۷۳ھ	چار لاکھ	۴۰۰۰
۶۔ نسائی (صوبہ خراسان کا گاؤں نسا)	۳۰۳ھ	دو لاکھ	۴۳۲۱

ان تصریحات سے دو باتیں واضح ہیں:۔ یعنی:۔

(۱) یہ تمام حضرات ایرانی تھے۔ ان میں سے ایک بھی عرب کا رہنے والا نہیں تھا۔

(۲) انہوں نے یہ روایات اس طرح جمع کیں کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ اس نے یہ بات اپنے باپ (یا استاد) سے سنی تھی۔ انہوں نے اپنے باپ (وغیرہ) سے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ دو سو سال پیچھے جاتے جاتے زبانی، کلامی، رسول اللہؐ تک پہنچ گیا۔ آپ غور کیجئے کہ اس طرح روایت در روایت کے متعلق کسی صورت میں بھی یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ اس طرح کے بیان کو تو عدالتوں میں بطور شہادت بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یعنی اگر کوئی گواہ کہے کہ مجھے اس بات کا ذاتی طور پر علم نہیں لیکن میں نے فلاں سے ایسا سنا ہے، تو عدالت اسے شہادت کے طور پر قبول نہیں کرے گی، چہ جائیکہ اس طرح سنی سنائی باتوں کا سلسلہ قریب دو سو سال تک مختلف راویوں کی زبانی آگے چلا آیا ہو! پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ ان روایات میں بعینہٖ الفاظ نہیں دہرائے جاتے تھے ان الفاظ کا مفہوم آگے منتقل ہوتا تھا۔ یعنی حضورؐ نبی اکرم نے کچھ ارشاد فرمایا سننے والے نے اس کا جو مفہوم سمجھا اسے کسی اور کو بتایا۔ اس نے اس سے جو کچھ سمجھا اسے آگے منتقل کر دیا۔ اور اس طرح یہ مفہوم در مفہوم، چھ سات راویوں کے ذریعہ آخر الامر جامع احادیث تک پہنچا۔ کیا اس مفہوم کو کسی صورت میں بھی قولِ رسول اللہؐ کہا جا سکے گا؟

(۳) اس طرح کے قریب چھ لاکھ روایات (بلکہ مفاہیم) امام بخاریؒ تک پہنچے۔ ان میں سے انہوں نے اپنے قیاس کے مطابق جس روایت کو صحیح سمجھا اسے رکھ لیا۔ باقیوں کو مسترد کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس وہ کونسا معیار تھا جس کی رُو سے وہ یقینی طور پر صحیح اور غلط میں فرق کر لیتے؟ انہوں نے بہرحال، اپنی رائے اور قیاس کے مطابق ہی یہ تفریق کی تھی۔

اب سوچئے کہ جس روایت کو صحیح حدیث کہا جاتا ہے اس کے یقینی طور پر ارشاد رسول اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟ یہ مفاہیم مختلف منازل میں سے گذرے، اور آخر میں امام بخاریؒ نے اپنے قیاس سے کسی کو صحیح اور کسی کو غلط قرار دے دیا! جنہیں صحیح احادیث رسول اللہؐ کہا جاتا ہے، وہ، وہ روایات ہیں، جنہیں جامعینِ احادیث نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح سمجھا۔ اس سے زیادہ ان کی صحت کی کوئی سند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ہر حدیث اس طرح درج ملے گی کہ "قال رسول اللہؐ ..... اس کے بعد اس حدیث کے الفاظ۔ اور آخر میں "او کما قال رسول اللہؐ"۔ یوں، یا جس طرح رسول اللہؐ نے فرمایا ہو! اس بنا پر ان لاکھوں حدیثوں میں ایک حدیث بھی ایسی نہیں جسے خود جامعینِ حدیث نے یقینی طور کہا ہو کہ حضورؐ نے ایسے ہی فرمایا تھا!

یہ ہے پوزیشن ان احادیث کی جو کتبِ احادیث میں جمع ہیں۔ اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت سے "اطیعو الرسول" کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ جب سوال پیدا ہوا کہ یہ تو انسانوں کی بیان کردہ روایات ہیں جنہیں انسانوں نے اپنے قیاس سے بعض کو صحیح اور بعض کو ضعیف قرار دیا، اس لئے ان سے یہ فریضہ کیسے ادا ہو جائے گا، تو یہ روایت وضع کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن اور قرآن کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور بھی دیا گیا۔ اور وہ میری احادیث ہیں" اس مبینہ روایت کے الفاظ غور طلب ہیں۔

علامہ ابوبکر خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب "کفایہ" میں لکھا ہے کہ

> حضرت مقدام بن معدیکربؓ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ سے سنا کہ حضورؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی۔ یاد رکھو! میں کتاب دیا گیا ہوں اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور بھی..... یاد رکھو! عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ لازم پکڑ لو اسی قرآن کو۔ جو کچھ اس قرآن میں حلال پاؤ اس کو حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔

قطعِ نظر اس کے کہ جو کچھ اس شخص کی طرف منسوب ہے قرآن کی رُو سے حقیقت وہی ہے، اس روایت کے الفاظ بالبداہت کہہ رہے ہیں کہ یہ الفاظ حضورؐ کے نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ کی لطافتِ ذوق۔ شائستگیٔ مزاج۔ حسنِ تکلم کے شایانِ شان ہی نہیں کہ آپؐ اس قسم کے استہزاء آمیز الفاظ استعمال فرماتے..... طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۵۲ء میں، اس روایت کی اسناد کا تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ قطعاً وضعی ہے۔

اس روایت کی رُو سے، روایات کو قرآن کی مثل قرار دینے کے بعد دل میں یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ،

اللہ تعالیٰ نے تو تمام نوعِ انسان کو چیلنج دیا تھا کہ اس قرآن کی ایک سورۃ کی مثل لاکر دکھاؤ - تو یہ روایات قرآن کی مثل کیسے ہوسکتی ہیں؟

اس کے جواب میں ایک اور عقیدہ وضع کیا گیا کہ احادیث بھی وحی ہیں - وحی کی دو قسمیں ہیں - ایک وحی متلو جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور دوسری وحی غیر متلو، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی - یہ احادیث ہیں - (یہ عقیدہ یہودیوں کا تھا) قرآن میں کہیں بھی وحی کی دو قسمیں نہیں بتائی گئیں - اس کی رُو سے وحی کی ایک ہی قسم ہے - اور وہ قرآن کے اندر مذکور و محفوظ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل مرحوم (سابق صدر جمعیت اہلِ حدیث) اپنے رسالہ "جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث" میں لکھتے ہیں :-

> تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا..... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں - ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مرادف۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث - صفحہ ۴۸)

بخاری اور مسلم کے مجموعوں کے متعلق آپ ارشاد فرماتے ہیں :-

> بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر اُمت متفق ہے...... ان احادیث کی صحت قطعی ہے۔ (ایضاً - صفحہ ۵۵)

بالفاظِ دیگر، مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کے نزدیک، بخاری اور مسلم کی کسی حدیث کے انکار کا وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا ہے - ان احادیث کا انکار کفر ہے اور ایسا کرنے والا مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو جاتا ہے - آگے چل کر وہ لکھتے ہیں :-

> جبرائیل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے تھے - آنحضرتؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے - اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ (ایضاً - صفحہ ۶۰)

جب وحی میں تفریق نہ رہی، اور قرآن اور حدیث میں مذکور وحی ایک ہی قرار پا گئی، تو مولانا مسعود احمد صاحب نے بات کھل کر کہہ دی کہ

> حدیث کو کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ (تفہیم اسلام - ایڈیشن سنہ ۱۹۶۷ء صفحہ ۴۲ - شائع کردہ - اہلِ حدیث اکادمی - لاہور)

لیکن دونوں کتابیں (قرآن اور حدیث) ہم پایہ نہیں - حدیث کا مقام قرآن سے بلند ہے - امام اوزاعیؒ کا قول ہے :-

> قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں۔[۱]

ایک اور امامِ حدیث، یحییٰ ابنؒ کثیر فرماتے ہیں :-

---

۱ - مختصر جامع بیان العلم - صفحہ ۲۲۳۔

حدیث، قرآن پر قاضی ہے، قرآن، حدیث پر قاضی نہیں۔[1]

قاضی کے معنی یہ ہیں کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد واقع ہو۔ (اور ایسا اکثر ہوتا ہے) تو فیصلہ حدیث کا قابلِ تسلیم ہوگا، نہ کہ قرآن کا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ تھا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ "فتنۂ انکارِ حدیث" میں لکھتے ہیں:۔

> نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے..... جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبیؐ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ (ص ۸۲)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

> رہی یہ بات کہ قولِ رسولؐ، قرآن کے خلاف ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ..... (۲/۱۸۰) "تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ۔ "وارث کے لئے وصیت نہیں ہے"۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (ص ۸۵)

اس کے بعد وہ اس کی علت سمجھاتے ہیں:۔

> اب اگر یہ کہا جائے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو نسخ کر دے۔ تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسولؐ کا قول اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے اور جس طرح قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسولؐ) دوسرے قول۔ یعنی قرآن کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (ص ۸۶)

جن آیات کو حدیث منسوخ کر دیتی ہے (ان حضرات کے عقیدے کی رُو سے) ان کی تلاوت باقی رہتی ہے۔ اور حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لایئے جس کا ایک حصہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ مخالفین نے حضورؐ سے کہا کہ اگر آپؐ قرآن میں کچھ تبدیلی کر دیں تو ہم آپؐ سے مفاہمت کر لیں گے۔ اس کے جواب میں خدا کا ارشاد ہوا:۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي

---

[1] مختصر جامع بیان العلم۔ ص ۲۲۳۔

اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (۶/۱۵)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ میں اپنی طرف سے قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا میرا منصب تو وحی خداوندی کا اتباع کرنا ہے۔ اور بس۔ اگر میں اس کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی مؤاخذۂ خداوندی سے بچ نہیں سکتا۔ میں اس مؤاخذہ سے ہمیشہ ڈرتا ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس رسولؐ کا اعلان یہ ہو، کیا وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا خیال تک بھی دل میں لا سکے گا؟ خود (حدیث کی اہم کتاب) مشکوٰۃ میں یہ روایت موجود ہے کہ

(حضرت) جابرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا۔ اور کلام اللہ میرے کلام کو منسوخ کر دیتا ہے۔

(مشکوٰۃ۔ جلد اوّل۔ کتاب اعتصام بہ کتاب و سنّت)

لیکن اس کے باوجود، ان حضرات کا یہی عقیدہ اور عمل ہے کہ حدیث، قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔

(۰)

عام طور پر (عوام کو مطمئن کرنے کے لئے) کہا جاتا ہے کہ حدیث صرف قرآن کے مجمل احکام کی تفسیر اور تشریح بیان کرتی ہے۔ اس کا اتنا ہی فریضہ ہے۔ لیکن مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے کہ یہ غلط ہے۔

حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر مراد یہ ہے کہ اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسّر کی ہے۔ یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے ..... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۵۰ء)

شروع شروع میں جب احادیث کو پرکھنے کے معیار مقرر کئے گئے تو ان کے سرفہرست یہ معیار تھا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہو وہ مسترد کر دینے کے قابل۔ لیکن اس سے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔ احادیث کی کتابوں میں جہاں ایسی روایات ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں، وہاں ایسی روایات بھی ہیں جو خود قرآن کے خلاف ہیں۔ لیکن (جیسا کہ مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے کہا تھا) بخاری اور مسلم کی تو کسی ایک حدیث کے انکار سے بھی مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان احادیث کو جو قرآن کے خلاف ہیں، ان کتابوں سے نکال دینے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہہ دیا کہ یہ معیار (کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہو وہی صحیح ہے) سرے سے غلط ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

دسمبر ۱۹۶۵ء کے رسالہ "فکر و نظر" راولپنڈی میں لکھا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ۔ فان وافقہ فاقبلوہ والا تذروہ (؟)

جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو۔ ورنہ اسے چھوڑ دو۔"

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے صحیح نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ حدیث گھڑ کر رسول اللہؐ کی طرف منسوب کی گئی تھی اسی دور میں ماہرینِ فنِ حدیث ائمہ کرام نے ببانگِ دہل اعلان کر دیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمانِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) نہیں۔

یعنی یہ کہنا کہ رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ میری طرف منسوب روایات کو قرآنی کسوٹی پر پرکھو جو اس کے مطابق ہو اُسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھو، زندیقوں کا مسلک ہے! اہلِ تقویٰ کا مسلک یہ ہے کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہو اسے صحیح سمجھو!! یا للعجب

اور اس تضاد کو اس طرح مٹاؤ کہ قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھو۔

آپ نے غور فرمایا کہ "اطیعوا الرسول" کا یہ مفہوم ہمیں کھینچ کر کہاں لے آیا؟ یعنی اب دین نام رہ گیا ان روایات کا جو دو سو سال تک زبانی کلامی بیان ہوتی رہیں اور جنہیں پھر جامعینِ حدیث نے اپنے قیاس کے مطابق صحیح تسلیم کیا۔ ان روایات نے کتاب اللہ کی جگہ لے لی!

سنّت

تشکیلِ پاکستان کے بعد، ان علماء اور جماعتوں نے (بالخصوص) جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی آخر دم تک مخالفت کی تھی، تقاضا شروع کر دیا کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ کرو۔ ان سے کہا گیا کہ یہاں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں اور علماء میں بھی باہمی اس قدر اختلاف ہے، تو اس صورت میں اس قسم کا ضابطہ، قوانین کس طرح مرتب کیا جا سکے گا جسے سب (متفقہ طور پر) اسلامی تسلیم کر لیں۔ کافی ردّ و کد کے بعد، ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندوں پر مشتمل اکتیس علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ:

(۱) شخصی قوانین ہر فرقہ کے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں۔ اور

(۲) ملکی قوانین (پبلک لاز) کتاب و سنت کے مطابق ہوں۔

یہ ریزولیوشن (یا منشور) پاس کر کے انہوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ دیکھ لیجئے! تمام علماء اس مطالبہ پر متفق ہو گئے ہیں۔ اگر اب بھی حکومت اسلامی قوانین مرتب اور نافذ نہیں کرتی تو یہ اس کی بدنیتی اور بددیانتی ہو گی۔ حکومت نے پراپیگنڈہ کے اس طوفان سے بچنے کے لئے اسے آئین میں شامل کر دیا۔

اس متفق علیہ مطالبہ کا ذرا تجزیہ کر کے دیکھئے سب سے پہلے یہ پوچھئے کہ اسلامی قوانین کو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تقسیم کرنے کے لئے اتھارٹی کونسی ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کی تفریق و تخصیص کا شائبہ تک

نظر نہیں آتا۔ نہ ہی صدرِ اوّل میں اس کا کوئی نشان ملتا ہے۔ یہ خالصتہً عہدِ ملوکیت کی ایجاد ہے جسے انگریزوں نے بھی یہاں برقرار رکھا تھا۔

دوسرے یہ کہ شخصی قوانین ہر فرقہ کے الگ الگ ہوں گے۔ اس سے اس فرقہ بندی کو آئینی سند حاصل ہو گئی جسے قرآن کریم نے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔

اب رہا پبلک لاز کا "کتاب و سنت" کے مطابق ہونا، تو اس شرط کا پورا کرنا بھی ناممکنات میں سے تھا۔ اوّل تو، ان حضرات کا اسی پر اتفاق نہیں کہ "سنت" کہتے کسے ہیں۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک، حدیث اور سنت میں کوئی فرق نہیں۔ ہر حدیث، سنّت ہے اور اس پر عمل کرنا اطاعتِ رسول۔ لیکن مودودی صاحب (مرحوم) اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک :-

> سنّت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے۔ یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جزو سنّت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ ..... تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلعم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلعم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے۔ اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنّت بنا دینا مقصود نہ تھا۔ (رسائل و مسائل۔ مودودی مرحوم۔ حصّہ اوّل۔ صفحہ ۳۱۱ (صفحہ ۳۱۷)

اسی کتاب میں وہ صفحہ ۳۱۴ پر لکھتے ہیں :-

> بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدّن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنّت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور نہ شرائعِ الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدّن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنّت بنا دیں۔ سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے لینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظامِ دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ حضورؐ نے جو امور اپنی بشری حیثیت سے سرانجام دیئے تھے انہیں دین قرار دینا' دین میں تحریف ہے۔ انہوں نے اپنی اسی کتاب میں لکھا ہے:۔

> میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۱۰)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:۔

> جو امور آپ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کر لیں، اللہ اور اُس کے رسولؐ کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۳۱۰)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے کسی مجموعہ میں یہ تخصیص نہیں کی گئی کہ حضورؐ نے کونسا کام رسول اللہ کی حیثیت سے سرانجام دیا تھا اور کونسا بشری حیثیت سے۔ اس صورت میں یہ کیسے متعین کیا جائے گا کہ..... "سنتِ رسول اللہؐ" کونسی ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے:۔

> جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرتِ مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہؐ کا مزاج شناس ہو جاتا ہے..... اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے..... اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۲۲ ؍ ۳۲۳)

لیجئے! اس "سنت" کا تعین ہو گیا جس کا اتباع دین ہے۔ یعنی پہلے تو جامعین احادیث (امام بخاریؒ وغیرہ) نے ان لاکھوں روایات میں سے جو انہیں ملیں، اپنے قیاس کے مطابق کچھ روایات الگ کر لیں اور انہیں احادیثِ رسول اللہؐ قرار دے دیا۔ آگے بڑھے تو، مزاج شناسِ رسول کی نگاہِ بصیرت نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان احادیث میں سے "سنت" کون کونسی ہے۔ اس طرح اس "دین" کا تعین ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے قیامت تک نظامِ حیات قرار دیا تھا! مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے مودودی مرحوم کے اس مسلک کے متعلق فرمایا تھا:۔

> اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی ایک بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسولؐ کا مزاج شناس تصوّر کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے

قبول کرلے۔ جسے چاہے رد کردے۔ یا کوئی عالم یا قائد یا دانشور کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی چمک" دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنّتِ رسول کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ ص ۹۳)

(٠)

اب آئیے "کتاب وسنّت" کی اس اصطلاح کی طرف۔ جسے ان حضرات نے اسلامی قوانین کی تدوین کے لئے آئینِ پاکستان میں شامل کرایا تھا۔ ہم نے اسی زمانہ میں کہہ دیا تھا کہ اس معیار کی رو سے، قیامت تک بھی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ اس لئے کہ "سنّت" ہر فرقہ کی الگ ہے جس میں وہ کسی قسم کے ردّ و بدل کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ان حضرات کے پاس، اس اعتراض کا جواب کفر کے فتوے کے سوا کیا ہو سکتا تھا! بیس برس تک یہ لوگ اپنے اسی "جہاد" میں مصروف رہے لیکن اس کے بعد مودودی مرحوم کو مجبوراً یہ اعلان کرنا پڑا کہ

کتاب وسنّت، کی رو سے پبلک لاز کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو شیعہ، اہلِ حدیث اور حنفیوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے۔ (ایشیا، مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مودودی مرحوم نے اِدھر تو یہ اعلان کیا اور اُدھر اپنی جماعت کے انتخابی منشور میں یہ شق بھی شامل کردی کہ:

جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے جو قرآن و سنّت کے اتباع کی پابند ہو۔

بہرحال، جب مودودی مرحوم نے کہا کہ "کتاب وسنّت" کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے، تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی کیا شکل ہوگی؟ فرمایا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کردی جائے! یعنی "کتاب وسنّت" کو تو اس لئے متروک قرار دے دیا کہ تمام فرقے اس پر متفق نہیں ہو سکیں گے۔ اور اس کا علاج یہ بتایا کہ یہاں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کردی جائے۔ گویا اس پر سب فرقے متفق ہو جائیں گے!! دوسرے فرقے تو ایک طرف، فقہ کے متعلق خود مودودی مرحوم کے عقائد یہ ہیں کہ:

(۱) اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے کہ (ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

(۲) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان و مکان کے تعیّنات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ ص ۲۲۶)

(۳) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرکے اجتہاد کرے

دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات۔ صفحہ ۱۲)

اس کے برعکس :-

تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس علم حقیقی ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرا برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات۔ صفحہ ۱۲)

(o)

فقہ

اس مقام پر مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ فقہ کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے وجود میں آئی۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ عہدِ عباسیہ میں، احادیث کو اس لئے جمع اور مرتب کیا گیا کہ ان کے ذریعے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا فریضہ ادا کیا جا سکے۔ لیکن اس زمانے تک زندگی کے تقاضے اس قدر بڑھ چکے تھے کہ احادیث کی رو سے تمام مسائل کا حل مل نہیں سکتا تھا۔ اور اگر ملتا بھی تھا تو احادیث کے عین مطابق عمل کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اس دشواری کے پیش نظر بعض متفقین نے سوچا کہ اسلام کو بہ ہیئتِ مجموعی سامنے رکھ کر اپنے غور و تدبر (تفقہ) کی رو سے ان مسائل کا حل مستنبط کیا جائے۔ ان کے اس طرح وضع کردہ قوانین کو فقہ کہا جاتا ہے۔ اور فقہی احکام کی پیروی کو "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" قرار دے دیا جاتا ہے۔ جب استنباطِ مسائل کی یہ طرح پڑی تو فقہی قوانین کے بکثرت مجموعے مرتب ہو گئے۔ ان میں سے چار نے زیادہ شہرت حاصل کی تھی۔ یعنی

(۱) امام اعظم ابو حنیفہؒ۔ (کوفی)۔ پیدائش سنہ ۸۰ھ۔ وفات سنہ ۱۵۰ھ
(۲) امام مالکؒ (یمنی)۔ " سنہ ۹۳ھ۔ " سنہ ۱۷۹ھ
(۳) امام شافعیؒ (عسقلانی یمنی)۔ " سنہ ۱۵۰ھ۔ " سنہ ۲۰۴ھ
(۴) امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی)۔ " سنہ ۱۶۴ھ۔ " سنہ ۲۴۱ھ

یہ سنی حضرات کے ائمہ فقہ ہیں۔ شیعہ حضرات کی فقہ جعفری الگ ہے۔ سنیوں میں اہلِ حدیث کا ایک فرقہ ہے جو کسی فقہ کے قائل نہیں۔ وہ براہ راست حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ احادیث، اصحابِ حدیث کے قیاس کی رو سے منتخب ہوئیں اور فقہ، فقہاء کے قیاس کا نتیجہ ہے۔ لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کا ذریعہ یہی احادیث یا فقہ ہیں۔ معتقدین حدیث کا عقیدہ ہے کہ حدیث، قرآن کی مثل ہے (مثلہ معہ) بلکہ یہ قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔ اسی طرح فقہ حنفیہ کے ایک مسلّم امام ابوالحسن عبیداللہ کرخیؒ کا قول ہے کہ:

ہر وہ حدیث جو اس طریقہ کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب (ائمہ فقہ) ہیں، یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ مؤول ہے یا منسوخ۔

(تاریخ التشریع الاسلامی، مولفہ علامہ محمد الخضری۔ اردو ترجمہ شائع کردہ، دار المصنفین اعظم گڑھ۔ صفحہ ۳۴۲)

ان حضرات کے نزدیک، دین، فقہ میں تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اب، فقہ میں نہ مزید تحقیق و تفتیش یا اجتہاد کی ضرورت ہے، نہ ان احکام میں کسی قسم کا ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے یہ خصوصیت کلمات اللہ (احکام و قوانینِ خداوندی) کی بتائی تھی کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے وضع کردہ ان احکام (فقہی قوانین) کو ابد تک غیر متبدّل قرار دے کر انہیں قوانینِ خداوندی کا ہم پایہ بنا دیا! یہ ہمارا قیاس نہیں۔ ان حضرات کا عقیدہ ہے کہ فقہی احکام' قرآن کی مثل ہیں۔ فقہ حنفی میں الھدایہ معتبر ترین کتاب ہے۔ اس کی جلد اوّل کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ "الھدایہ کا القرآن" (بحوالہ ہفت روزہ اہلِ حدیث۔ مورخہ ۱۲ $\frac{۲}{۸۴}$)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ اس نکتہ پر غور کیجئے جو ہمارا بنیادی موضوعِ گفتگو ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، (شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر) سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ہیں جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے۔ ان میں جو روایات آگئی ہیں وہ غیر متبدّل ہیں۔ اس کے بعد فقہ کے (کم از کم) چار ائمہ کی طرف منسوب قوانین ایسے ہیں جو غیر متبدّل سمجھے جاتے ہیں۔ کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ ان کے متبعین اپنے اختلافات چھوڑ کر، اُمّتِ واحدہ بن جائیں!

(ضمناً) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور اختلاف کو خدا کے غضب کا موجب۔ جب ان آیاتِ قرآنی کو بہ تکرار و اصرار سامنے لایا گیا جن میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے، تو یہ حضرات بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ ان کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے ذرا سی امید بندھتی تھی کہ شاید یہ حضرات اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور سوچیں کہ اس شرک کو توحید سے کس طرح بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن (معلوم نہیں وہ کون تھا جس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ) یہ

مکاتبِ فکر

فرقے ہیں ہی نہیں۔ یہ مکاتبِ فکر ہیں۔ اس خود فریبی یا ابلہ فریبی سے یہ حضرات بہت خوش ہو گئے کہ اب ہم فرقوں کے پابند رہتے ہوئے بھی مشرک قرار نہیں پائیں گے (یعنی رام داس کا نام عبد الرحمٰن رکھ دینے سے سمجھ لیا کہ وہ کافر نہیں رہا۔ مسلمان ہو گیا ہے!

ذرا مکاتبِ فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمائیے۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکّر (فلاسفر) گذرے ہیں۔ (مثلاً) بو علی سینا۔ فارابی۔ رازی۔ الکندی۔ وغیرہ ..... ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مکتبۂ فکر" (SCHOOL OF THOUGHT.) تھا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بو علی سینا کے مکتبۂ فکر کے پیرو اپنی نماز الگ پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبۂ فکر الگ نماز! کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بو علی سینا کے طریق پر نماز ادا کرتا ہو، یا فارابی کے طریق پر!..... ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے، بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ـــــ صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِىْ اُصَلِّىْ (کتاب

نمازوں کا اختلاف

الاذان)۔ "تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو"۔ ـــــ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی کہ حضورِ نبی اکرمؐ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں۔ انہوں نے نہ صرف، یہ کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد آج تک نہ تو اُمّت میں ذرا سا بھی انقطاع (GAP) واقعہ ہوا ـــ

یعنی یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔ نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا۔ بالفاظِ دیگر، لاکھوں مسلمانوں نے حضورؐ کے ساتھ، حضورؐ جیسی نماز ادا کی اور اس کے بعد اس عملِ محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عملِ محسوس آج بھی بعینہٖ ویسا ہونا چاہیئے جیسا رسول اللہؐ کے زمانے میں تھا! لیکن امرِ واقعہ کیا ہے؟ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے۔ اور طُرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہی ہے جو رسول اللہؐ ادا فرماتے تھے! کیا عقلِ سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہؐ کی نماز کے مطابق ہے؟ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز "جزئیات" تک، رسول اللہؐ کی نماز کے مطابق ہے؟ احادیث کی رُو سے۔ فقہ کی رُو سے۔ مختلف، حدیثیں اور فقہی احکام، ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند بہم پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بحث اس امر پہ چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔

کہہ دیا جاتا ہے کہ (شیعہ حضرات کی نماز سے قطعِ نظر) سُنیوں کے مختلف فرقوں کی نماز میں جو اختلاف ہے وہ فرعی سا ہے۔ اصولی طور پر سب کے ہاں نماز مشترک ہے اور ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ سو اوّل تو یہی غلط ہے کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ان فرقوں کے نزدیک، انہیں اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ ایک فرقے کے پیروکار کسی دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا تو کجا اگر (مثلاً) نیچی آواز سے آمین کہنے والا اونچی آواز سے آمین کہنے والوں کی مسجد میں نماز پڑھ لے تو وہ' اگر اپنی مسجد کا فرش اکھیڑ نہیں دیں گے، تو کم از کم' اسے دس بار دھو کر پاک اور صاف ضرور کریں گے۔ یہ جو آئے دن "وہابیوں اور بدعتیوں" یا "بریلویوں اور دیوبندیوں" کی مسجدوں میں تنازعے اُٹھتے ہیں —— امام قتل کر دیئے جاتے ہیں —— مقتدیوں میں دنگا فساد ہوتا ہے —— پولیس مداخلت کرتی ہے —— مسجد پہ تالا پڑ جاتا ہے اور مقدمہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے —— تو یہ نماز کے فروعی اختلافات کی وجہ ہی سے ہوتا ہے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ ان فروعی اختلافات کو چنداں اہمیت حاصل نہیں، حقیقت کا ابطال اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے فرار کی راہ اختیار کرنے کے مرادف ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیئے کہ جب کسی حکم کو خدا (یا اس کے رسول) کا متعین فرمودہ قرار دیا جائے تو اس کے اصول اور فروع سب اپنی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً قرآنِ کریم نے وضو کے سلسلہ میں کہا ہے: فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ...... (۵/۶) اپنے منہ دھو یا کرو۔ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ پہنچوں تک دھوئے، اور دوسرا کہنیوں تک، تو کیا آپ کہہ دیں گے کہ یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔ کیونکہ یہ فرق محض فرعی ہے اصولی نہیں؟ ایسا کہنا صریحاً غلط ہوگا۔ ان میں سے ٹھیک ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور وہی ٹھیک ہو سکتا ہے جس کا عمل قرآن کے حکم کے مطابق ہو۔ لہٰذا، نماز کی جو جزئیات رسول اللہؐ نے متعین فرمائی تھیں، جب تک ان کی بعینہٖ پابندی نہیں کی جائے گی، نماز، رسول اللہؐ کی نماز کے مطابق قرار

نہیں پائے گی۔ یہ کہنا کہ کسی نے ہاتھ کانوں تک اٹھائے یا نیچے رکھے۔ ہاتھ سینے تک باندھ لئے یا زیرِ ناف۔ آمین بالجہر کہی یا خفی۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا یا اُتنا۔ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہ پڑھی، یا فلاں دعائیں پڑھ لی یا یوں۔ تراویح آٹھ پڑھ لیں یا بیس۔ عید کی نماز میں تکبیریں اتنی کہہ لیں یا اُتنی۔ نماز فلاں وقت پڑھ لی یا فلاں وقت، ۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جزئیات کا فرق ہے۔ محض اعتراض سے بچنے کا بہانہ ہے۔ اگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو (مثلاً) کسی اہلِ حدیث سے کہئے کہ وہ حنفیوں کی سی نماز پڑھ کر اعلان کردے کہ اس کی نماز ہوگئی ہے؛ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

آپ نے یہ اعتراض عام طور پر سنا ہوگا کہ اگر ہم احادیث کو نہ مانیں تو بتائیے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے گی! اس کا اوّلیں جواب تو قصرِ بحثِ بالا میں موجود ہے کہ احادیث کی رُو سے کونسی نماز کو رسول اللہؐ کی نماز کہا جائے گا؟

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اقیمُوا الصّلوٰۃ آیا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ حکم مجمل ہے اور اس اجمال کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے۔ اس تفصیل کے مطابق نماز ادا کرنے سے خدا کے حکم کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔

قرآنِ کریم میں یہ بھی حکم آیا ہے کہ اِعْدِلُوْا (۵/۸) یعنی عدل کرو۔ یہ حکم بھی اسی طرح مجمل ہے جس طرح اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃ کا حکم۔ کیا اِعْدِلُوْا کے اجمالی حکم کی تعمیل کے لئے احادیثِ رسول اللہؐ میں دی گئی تفاصیل کی ضرورت نہیں؛ یعنی ان تفاصیل کی کہ عدل کی مشینری کس قسم کی ہوگی، اس کا طریق کار (PROCEDURE) کیا ہوگا؛ نماز کی تفاصیل اور جزئیات کے متعلق تو انبار در انبار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور تصنیف کی جا رہی ہیں۔ کیا عدل کی مشینری۔ اس کی جزئیات۔ اس کے طریق کار کی تفاصیل بھی احادیث کی رو سے اس طرح مرتب کی گئی ہیں؟ اگر نہیں کی گئیں تو کیوں؟ یہ واضح ہے کہ نبی اکرمؐ مسجدِ نبوی میں عدل کا فریضہ ادا فرماتے تھے! اطاعتِ سنت کی رُو سے تو آج بھی مساجد ہی میں عدالتیں قائم ہونی چاہئیں۔ کیا علماء کرام میں سے کسی نے آج تک یہ فتویٰ دیا ہے کہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی عمارات میں بیٹھ کر عدل کرنا خلافِ سنتِ رسول اللہؐ لہٰذا، ناجائز ہے؟ اگر ایسا نہیں کیا گیا (اور ظاہر ہے نہیں کیا گیا) تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی جزئیات اور نظامِ عدل کی جزئیات میں یہ فرق کیوں کیا جا رہا ہے؟

یا مثلاً۔ قرآن میں ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ..... (۲/۱۸۲) "تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں"۔ روزوں کے جزئیاتی احکام بھی احادیث کی رُو سے مرتب کئے جاتے ہیں اور ان کی پابندی ضروری۔ ان میں سے کسی ایک جزئیہ کی خلاف ورزی سے بھی روزہ نہیں ہوتا!

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم میں یہ بھی آیا ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ ..... (۲/۲۱۶) "تم پر جنگ فرض قرار دیا گیا ہے"۔ کیا قتال (جنگ) کی بھی روزوں جیسی جزئیات مرتب کی گئی ہیں؟

حضورؐ کے زمانے میں جنگ تیروں اور تلواروں کے ذریعے لڑی جاتی تھی۔ کیا آج بھی اس سُنّتِ رسول اللہؐ کے اتباع میں، جنگ تیروں اور تلواروں سے لڑی جائے گی، اور بندوقوں اور توپوں کے

ذریعے جنگ لڑنا خلافِ سنّت۔ لہٰذا، ناجائز قرار پا جائے گا؟

سوچئے کہ نماز اور روزہ سے متعلق احکام میں سنّتِ رسول اللہؐ کی مطابقت کے بارے میں اس قدر شدّت اور عدل اور قتال کے احکام کے سلسلہ میں سنّتِ رسول اللہؐ سے ایسی بے اعتنائی!۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ احکام اس زمانے میں مدوّن ہوئے تھے جب مذہب اور حکومت میں ثنویت پیدا ہو چکی تھی جس کی رُو سے نماز، روزہ مذہب کے دائرے میں آ گئے تھے۔ اور عدل اور قتال حکومت کے حیطۂ اقتدار میں۔ لہٰذا، اتباعِ سنّت کی تاکید اور شدّت اعتقادات اور عبادات کے باب میں برتی گئی۔ اور نظامِ حکومت کو مملکت کے حوالے کر دیا گیا۔

اسلامی مملکت میں ایسا نہیں ہوگا، اس میں قرآن کے تمام مجمل احکام کی تفصیلات، مملکت متعیّن کرے گی۔

---(۰)---

بات یہاں سے چلی تھی کہ اور تو اور نماز جیسے بنیادی فریضہ میں بھی اس قدر اختلافات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور ان کی بنیاد احادیث اور فقہ پر ہے۔ اس کے بعد سوچیئے کہ کیا آج کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے حتمی اور یقینی طور پر متعیّن کیا جا سکے کہ رسول اللہؐ کس طریق کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے؟ اسی ایک مثال پر دیگر احکام کو قیاس کر لیجئے! اور پھر آپ خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ ان احکام کی ادائگی سے کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہم "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کا فریضہ ادا کر رہے ہیں!

یہ تمام خلفشار اور انتشار۔ یہ سب اختلاف و افتراق۔ یہ ساری بے یقینی اور نامحکمی۔ یہ سب اس لئے ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد ملوکیت آ گئی اور "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" کا قرآنی مفہوم اُمّت کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، اور اس کا مفہوم ہم نے اپنے ذہن سے متعیّن کر لیا۔ اطیعوا اللہ کے متعلق کہہ لیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ اور اطیعوا الرسول کا ذریعہ وہ احادیث جنہیں رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اور ان پر مبنی فقہی احکام۔ جب تک دین کی اس اساس اور بنیاد کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا، اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا، نہ اُمّت میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے، نہ دین کا تمکن اور اسلام کا احیاء ہو سکتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

---(۰)---

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا قرآنی مفہوم

مختصر الفاظ میں یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ اب ہم اس اجمال کی تفصیل کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" سے دو الگ الگ اطاعتیں مقصود نہیں۔ (یعنی اللہ کی اطاعت الگ۔ اور رسول کی اطاعت الگ)۔ دین میں اطاعت صرف خدا کی مطلوب ہے۔ رسول اللہؐ بھی خدا کی اطاعت کرتے تھے اور خدا ہی کی

اطاعت کراتے تھے۔ حضورؐ کا عظیم ترین مقام و منصب عبدہ (خدا کا محکوم و اطاعت گذار) ہے۔ اس کا اعلان ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اسلام مذہب نہیں جس میں ہر شخص انفرادی طور پر خدا کی پرستش، بندگی، پوجا پاٹ (WORSHIP) کرے تو اطاعت کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ دین ہے، یعنی نظامِ حیات، جس میں خدا کی اطاعت صرف اپنی آزاد مملکت میں ہو سکتی ہے۔ یہ مملکت (یا اس کی حکومت) دنیا میں منفرد تھی۔ یعنی اس میں محکومیت کسی انسان کی نہیں ہوتی تھی۔ صرف خدا کی ہوتی تھی۔ اور خدا نے اس مقصد کے لئے اپنی کتاب نازل کی تھی۔ لہٰذا، اس میں اطاعت صرف کتاب اللہ کی تھی۔

لیکن انسانی دنیا میں کتاب اللہ کی حکومت بھی نظام کے تحت ممکن تھی۔ یہ نظام نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ جس کے اوّلین سربراہ بھی حضورؐ خود تھے۔

اس اندازِ حکومت اور اطاعت کے لئے، قرآن کریم نے ایک منفرد اصطلاح مقرر کی۔ یعنی "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول"۔ اس سے مراد یہ تھی کہ خدا کی اطاعت، لیکن انفرادی طور پر نہیں۔ اس نظام کی رُو سے جسے رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا۔ اور رسولؐ کی بھی اپنی اطاعت نہیں، بلکہ رسولؐ کی وساطت سے خدا کی اطاعت۔ ایک آئینی نظامِ حکومت میں، حکومت کے ادنےٰ سے ادنےٰ عامل کے حکم کی اطاعت، اس کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس حاکمِ اعلےٰ کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ کارپرداز ہوتا ہے۔ جب چوراہے پر کھڑا سپاہی آپ سے کہتا ہے کہ بائیں طرف چلئے، تو وہ آپ سے اپنا حکم نہیں منواتا۔ حاکمِ اعلیٰ کا حکم منواتا ہے۔ قرآنی حکومت میں بھی صورت ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب وہ کہتا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ... (۴/۸۰) تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم جو رسولؐ کے حکم کی اطاعت کرتے ہو تو یہ رسولؐ کی اطاعت نہیں۔ یہ خدا کی اطاعت ہوتی ہے کیونکہ رسولؐ احکامِ خداوندی کی اطاعت کراتا ہے۔ اپنی نہیں۔ اس کا منصبی فریضہ ہی خدا کی اطاعت کرانا ہے۔ اطاعت کے اسی اندازکو وہ "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) سورۃ المائدہ کی مشہور آیت ہے:۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ (۵/۳۳)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے:۔

بلاشبہ ان لوگوں کی جو "اللہ اور اس کے رسول" کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور ملک میں فساد پھیلانے کے لئے دوڑتے پھرتے ہیں، یہ سزا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی چڑھا دیا جائے

یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمت سے کاٹ دیئے جائیں۔ یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ ان کے لئے اس دنیا میں رسوائی ہے۔ اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔

اس میں "اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ" کے الفاظ آئے ہیں۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک سب کے نزدیک اس سے مراد اسلامی حکومت کے خلاف جنگ کرنے کے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں امام محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل میں، اور نواب صدیق حسن خان (مرحوم) نے فتح البیان میں لکھا ہے:۔

حضرت ابن عباس۔ سعید بن مسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ (ریاست) میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پُرخطر کر دیا۔ پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام (سربراہِ مملکت) کو اختیار ہے (کہ جو چاہے سزا دے)۔

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے، تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا اس کو چاہے دے۔

ہمارے زمانے میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اپنی تفسیر، تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

(فساد فی الارض میں) زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی مملکت نے لے رکھی ہو۔ اور "خدا اور رسول" سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلامی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو..... ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا..... خدا اور رسول کے خلاف جنگ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے "بادشاہ کے خلاف لڑائی" (WAGING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ کی دست رس سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۴۶۵۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس آیت میں "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ آئینی حکومت میں صورت یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ عاملِ حکومت، جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس حکم کی اطاعت، اس عامل کی اطاعت نہیں ہوتی، اس حکومت کی اطاعت ہوتی ہے جس کا وہ نمائندہ ہے۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے

ط یہ تقسیم ہند سے پہلے کی تحریر نظر آتی ہے۔

رسولؐ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ دوسری طرف حکومت کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کرانے میں، افسرِ مجاز ... جو کچھ کرتا ہے، حکومت اس کا اعلان کرتی ہے کہ وہ اس نے نہیں کیا، خود حکومت نے کیا ہے۔ حکومت اس کی پوری پوری ذمہ داری لیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ (مثلاً) جنگِ بدر میں، نبی اکرمؐ اور جماعتِ مجاہدین، مخالفین کو تہ تیغ کرتے ہیں اور خدا کا ارشاد ہوتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ ... (۸/۱۷) "تم نے انہیں قتل نہیں کیا تھا، ہم نے قتل کیا تھا" اور نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا جاتا ہے کہ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ... (۸/۱۷) "میدانِ جنگ میں تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے"۔ ان کے ہر اقدام کی ذمہ داری خدا خود اپنے اوپر لیتا تھا۔ یا (مثلاً) صلح حدیبیہ کے موقعہ پر ایک اور نازک وقت آگیا کہ جماعتِ مومنین نے، خدا کے ہاتھ اپنی جان و مال بیچ دینے کا جو معاہدہ کر رکھا تھا۔ (۹/۱۱۱) اس کی تجدید کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ قاعدے کے مطابق، صحابہ آتے تھے۔ تجدیدِ معاہدہ (بیعت) کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے تھے اور حضورؐ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر اس بیعت کی توثیق فرما دیتے تھے۔ اس موقعہ پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ ۚ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ... (۴۸/۱۰) "اے رسول! تمہارے جو رفقاء تجدیدِ معاہدہ کے لئے جو تمہاری بیعت کرتے تھے، وہ تمہاری بیعت نہیں۔ درحقیقت ہماری بیعت تھی۔ ان کے ہاتھ کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں تھا۔ اللہ کا ہاتھ تھا"۔ آئینی حکومت میں ہوتا ہی یہی ہے۔ حکومت کے ساتھ جتنے معاہدات ہوتے ہیں، افسرانِ مجاز ان پر دستخط کرتے ہیں۔ اور حکومت ان کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ معاہدہ خود حکومت کے ساتھ ہوا ہے۔ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ... (۴/۸۰) کا مفہوم یہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ حکومت اس کا بھی اعلان کرتی ہے کہ اس معاہدہ کی پابندی موجودہ حکومت پر ہی لازم نہیں۔ اس حکومت کے بعد بھی جو حکومت آئینی طور پر قائم ہوگی (اس حکومت کی جانشین ہوگی) اس پر بھی اس کی پابندی لازمی ہوگی۔

یہ تھا مفہوم حضورؐ کے اس ارشاد کا کہ تم پر میرے طریق کی پیروی اور میرے خلفاء (جانشینوں) کے طریق کی پیروی ضروری ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں انسانوں کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، انہیں وہ اس نظام کے ذریعے پوری کراتا ہے۔ براہِ راست خود آکر پورا نہیں کرتا۔ (اس موضوع پر میں اس سے پہلے بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں)۔

(۰)

اب پھر اصل موضوع کی طرف آیئے۔ ہم کہہ رہے تھے کہ "اللہ اور رسول کے خلاف جنگ" سے مراد نظامِ حکومت خداوندی کے خلاف جنگ تھی۔ اس سلسلہ میں سورۃ المائدہ کی آیت (۵/۳۳) ہمارے سامنے آچکی ہے۔ دیگر حوالہ جات درج ذیل ہیں:-

(۲) "خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ" کے متعلق، مسجدِ ضرار کے سلسلہ میں ہے کہ وہ مسجد پناہ گاہ تھی

ان لوگوں کے لئے لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ..... (۹/۱۰۷) جنہوں نے "خدا اور رسول" کے خلاف جنگ کی تھی۔ (نیز ۹/۶۳)۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے کہ اگر تم لوگ بقایا (سود) نہ چھوڑو گے تو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ..... (۲/۲۷۹) تو اسے "اللہ اور رسول" کی طرف سے اعلان جنگ سمجھو۔

۳۔ سورۂ انفال کی پہلی آیت ہے: قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ..... (۸/۱) "انفال اللہ اور رسول کے لئے ہیں" (انفال کے معنی عام طور پر مالِ غنیمت کئے جاتے ہیں)۔ یہاں کہا ہے کہ انفال اللہ اور رسول کے لئے ہیں۔ امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

انفال کے معانی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرینِ صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امامِ وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی "اللہ اور رسول" سے مراد امامِ وقت (یعنی اس وقت کی حکومت کا سربراہ) ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اس آیت کے تحت اپنے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ

مالِ غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ پڑ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔ (ترجمان القرآن۔ جلد دوم۔ صـ۵۱۳)

اسی طرح مالِ غنیمت کے خمس کے متعلق ہے کہ وہ "اللہ اور رسول" ..... کے لئے ہے۔

۴۔ سورۂ حشر میں ان یہودیوں کے متعلق جنہوں نے اسلامی مملکت کے خلاف سرکشی (فتنہ) کی تھی فرمایا کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ..... (۵۹/۴)۔ ان کے خلاف یہ قدم اس لئے اٹھانا پڑا کہ انہوں نے "اللہ اور رسول" کے خلاف سرکشی کی تھی۔ سورۂ احزاب میں ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ..... (۳۳/۵۷) "جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ..... اگر یہاں اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ لئے جائیں تو بات بن ہی نہیں سکتی۔ (اس لئے کہ خدا کو اذیت کون پہنچا سکتا ہے) اس سے مراد اسلامی نظام کیلئے اذیت اور پریشانی کا موجب بننا ہے۔

۵۔ اب آگے بڑھیئے۔ فتح مکہ کے بعد اسلامی مملکت نے فیصلہ کیا کہ مشرکین کو کعبہ میں آنے سے روک دیا جائے۔ اس کے لئے ۹ھ حج اکبر کے اجتماع میں اعلان کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۹/۱)

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ..... (۹/۳)

جن مشرکین کے ساتھ تم نے صلح کا معاہدہ کیا تھا (لیکن انہوں نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی) ان کے لئے، اس حج اکبر کے اجتماع میں، اعلان کر دو کہ خدا اور رسول نے اس معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیا ہے اور اس کے بعد وہ اس باب میں بری الذمہ ہیں۔

ظاہر ہے کہ معاہدات کسی بھی حکومت کی طرف سے کئے جاتے ہیں اور انہیں کالعدم بھی حکومت ہی کی طرف سے قرار دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں "اللہ اور رسول" کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

۶۔ قرآنِ کریم میں ایسی آیات بھی آئی ہیں جن میں "اللہ اور رسول" کے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کے لئے صیغۂ واحد کا استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ عربی زبان کے قاعدے کی رُو سے، ان کے لئے تثنیہ کا صیغہ آنا چاہیئے تھا۔ اس سے بھی واضح ہے کہ "اللہ اور رسول" سے دو الگ الگ اطاعتیں مراد نہیں بلکہ ایک ہی مراد ہے۔ یعنی نظامِ حکومت کی اطاعت (مثلاً):۔

(ا) سورۂ انفال میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۝ (۸/۲۰)

اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے (عَنْهُ ... واحد کا صیغہ ہے) روگردانی نہ کرو۔ درآنحالیکہ تم اس حکم کو سن رہے ہو۔ (اس کی تشریح ذرا آگے چل کر کی جائے گی)۔

(ب) اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! تم "اللہ اور رسول" کی دعوت پر لبیک کہو۔ جبکہ وہ (صیغۂ واحد) تمہیں اس امر کی طرف بلا رہا ہے جو تمہیں زندگی عطا کرے گا۔ (نیز ۱۲/۱۰۸)

(ج) سورۂ نور میں ہے:۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ۝ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ (۲۴/۴۸-۴۹)

اور جب (ان منافقین کو) اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ (صیغۂ واحد) ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کر لیتا ہے۔ اور اگر ان کا کوئی حق کسی پر واجب ہو تو پھر یہ اس کی طرف (صیغۂ واحد) سر جھکائے ہوئے چلے آتے ہیں۔

(د) اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے:۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (۲۴/۵۴)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں۔ اس کے بعد اگر یہ اس اطاعت سے روگردانی کرنے لگ جائیں تو یہ سمجھ رکھیں کہ اس پر (صیغۂ واحد) صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہے، اور وہ تبلیغ احکام خداوندی ہے۔ اور ان پر ان کی ذمہ داری۔ اگر انہوں نے اس کی (صیغۂ واحد) اطاعت کر لی تو صحیح راستے پر لگ جائیں گے۔

ان آیات میں دیکھئے! "اللہ اور رسول" کے الفاظ آئے ہیں لیکن صیغے اور ضمائر واحد کے استعمال کئے گئے ہیں۔

یہ اس حقیقت کی بیّن دلیل ہے کہ اس اصطلاح سے مفہوم ——— اسلامی نظامِ حکومت ہے۔

۷۔ آیت (۸/۲۰) میں کہا گیا ہے: اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ‌ۚ۔ "تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی ——— ——— اور اس سے روگردانی نہ کرو۔ جبکہ تم سن رہے ہو"۔

سمع وطاعت

وَاَنۡتُمۡ تَسۡمَعُوۡنَ۔ (تم سن رہے ہو)۔ میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ کتاب صامت (خاموش) الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا حکم سنا جائے۔ قرآنِ کریم میں اطاعت کے لئے سماعت (سننے) کی شرط متعدد مقامات میں آئی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا..... (۲/۲۸۵) مومنین کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں ——— "ہم نے اس حکم کو سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ سورۃ المائدہ میں ہے: اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا...... (۵/۷) "جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا ہے۔ اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ سورۂ نور میں ہے کہ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا‌ؕ..... (۲۴/۵۱) "جب انہیں اللہ اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ (صیغہ واحد) ان کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کرے۔ تو وہ کہیں کہ ہم نے سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے۔ دین میں خالی کتاب کی اطاعت ممکن نہیں۔ اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ جو حسبِ موقعہ اور ضرورت، کتاب کے احکام کا آرڈر دے اور جماعت اس آرڈر کی تعمیل کرے۔ حضورؐ نبی اکرم نے جو نظام قائم کیا تھا اس میں حضورؐ خود وہ پہلی زندہ اتھارٹی تھے جن کے آرڈرز کو سنا جاتا تھا اور ان کی اطاعت کی جاتی تھی۔ یہی وہ نظام تھا جسے حضورؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، کتاب اللہ کی اطاعت، ایک زندہ اتھارٹی کی وساطت سے ہوتی رہی۔ جب وہ نظام درہم برہم ہو گیا تو (قرآنی حکومت کے آرڈر دینے والی) زندہ اتھارٹی باقی نہ رہی۔ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور اطاعت کے لئے مجرد کتابوں کو کافی سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ وہ اختلاف و افتراق ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ زندہ اتھارٹی وہ مرکز ہوتی ہے جس کے ساتھ وابستگی سے امّت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ وہ نہ رہے تو وحدت، امّت کی کوئی صورت ہو نہیں سکتی۔

آخر میں ہم ایک ایسی آیت سامنے لاتے ہیں جس کے بعد یہ سمجھنے اور سمجھانے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کہ قرآن کی رُو سے، "اللہ اور رسول" سے مراد، قرآنی نظامِ حکومت ہے۔ یہ نظام، ابتداءً مدینہ میں قائم ہوا تھا۔ مسلمان دیگر مقامات (بالخصوص مکہ) میں بھی تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا۔ (بلکہ اسے ایمان کی شرط قرار دیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ آ جائیں۔ دیکھئے، اس کے لئے الفاظ کونسے استعمال کئے گئے تھے۔ فرمایا:۔

وَمَنۡ يُّهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً‌ ؕ

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴/۱۰۰)

جو شخص خدا کی راہ میں ہجرت کرے گا اسے دوسرے مقام میں بہت سی پناہ گاہیں، اور کشائش کی راہیں مل جائیں گی۔ جو شخص اللہ اور رسول کی طرف جانے کے ارادے سے گھر سے نکلے، اگر وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہ بھی پہنچ پائے اور اسے راستے ہی میں موت آجائے تو خدا کے ہاں سے اسے بھی پورا پورا اجر مل جائے گا۔ نظامِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کے پورے پورے سامان موجود ہوتے ہیں۔

غور فرمایئے۔ یہاں حکم تھا اسلامی نظام کی طرف ہجرت کرنے کا اور اس کے لئے "اللہ اور رسول" کی طرف جانے کے الفاظ آئے ہیں۔ اگر خالی "رسول" کا لفظ ہوتا تو پھر بھی کہا جا سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ مقام (مدینہ) ہے جہاں حضورؐ اقامت پذیر ہیں۔ لیکن یہاں رسول کے ساتھ، اللہ کا لفظ بھی آیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص مقام میں اقامت پذیر نہیں ہوتے کہ اس مقام کی طرف جانے کو ہجرت قرار دیا جائے۔ لامحالہ، اللہ اور رسول سے مراد ہی اس مقام کی طرف ہجرت ہے جہاں اسلامی نظام قائم ہو گیا تھا۔

اس ضمن میں ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے۔ مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا یہ حکم اس زمانے میں ملا تھا جب نظامِ خداوندی مدینہ میں قائم ہوا تھا اور مکہ میں غیر خداوندی نظام رائج تھا۔ بعد میں جب مکہ فتح ہوا اور وہاں بھی قرآنی نظام رائج ہو گیا تو پھر وہاں کے مسلمانوں کو "اللہ اور رسول" کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نہیں کہا گیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بعد "اللہ اور رسول کی اطاعت" مکہ میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس طرح جب، قرآنی مملکت دور دراز کے علاقوں میں بھی پھیل گئی اور وہاں بھی اسلامی نظام قائم ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ وہاں کے مسلمانوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ "اللہ اور رسول" کی طرف ہجرت کریں، بلکہ خود مدینہ کے مسلمان ان علاقوں میں جا جا کر بس گئے۔ یہ اس لئے کہ اب وہاں بھی "اللہ اور رسول" (نظامِ حکومتِ خداوندی) موجود تھا۔

(۰)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول، کا مفہوم کیا ہے۔ اسلام کے صدرِ اوّل (عہدِ رسالت مآبؐ و خلافتِ راشدہ) میں اس کا یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی تو نظامِ حکومتِ خداوندی بھی باقی نہ رہا، اور اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم کی مختلف اصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" میں اللہ کی اطاعت الگ، اور رسول کی اطاعت الگ تصوّر کر لی گئی۔ اور رسول کی اطاعت کے لئے روایات کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔ اگر اُمّت کی قسمت یاوری کرتی تو سوچا جاتا کہ وہ کونسی کڑی گم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے دین کا سارا نقشہ بدل گیا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور اُمّت دین کی جگہ مذہب پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد آج تک

یہی کیفیت چلی آرہی ہے۔ اگر غلط کانٹا مڑنے سے گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑے تو ابتداءً (غلط اور صحیح پٹڑیوں میں) چند انچوں کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی جائے، وہ منزل سے دُور تر ہوتی جاتی ہے اور جس قدر تیز رفتار سے وہ چلے منزل سے اس کا بُعد اسی نسبت سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس ہزار برس میں، اُمّت کی گاڑی کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ جتنی کوششیں "اسلام" کے فروغ کے لئے کی جاتی ہیں، ان سے مذہب کی گرہیں اور مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور چونکہ مذہب پیشہ (PROFESSION) بن چکا ہے اس لئے اس سے وابستہ مفاد پرستیاں ان گرہوں کو اور بھی زور سے کستی رہتی ہیں۔

اندریں حالات، دین کا احیاء اُن سعادت مند افراد کے ذریعے ہی ممکن ہوگا جو دین کے قرآنی تصوّر کو اچھی طرح سمجھ کر، اسے عملی پیکر میں متشکل کرنے کی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ لیکن اس مقصد کے لئے دین کے تصوّر کا سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ اپنی سیرت و کردار کو حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھالنا بھی ضروری ہوگا۔ یہ شرط جذباتی نہیں، خود خدا کی عائد کردہ ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [1] .... (۳۳/۲۱) "یہ حقیقت ہے کہ رسول کی زندگی تمہارے لئے بہترین (بلکہ حسین ترین) ماڈل ہے"۔ اس ماڈل کے بنیادی خط و خال بھی اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کے اندر محفوظ کر دیئے ہیں۔ میں نے حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ قرآنی آئینہ کے مطابق مرتب کی ہے (جو معراجِ انسانیت کے نام سے قریب پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے)۔ اس میں سیرتِ نبویؐ کے بنیادی عنوانات قرآن سے لے کر، احادیث اور تاریخ سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اس قرآنی عنوان کی تائید کرتے ہیں۔ اس سیرتِ طیّبہ کو بطور ماڈل سامنے رکھنے سے مومن کے اندر وہ صفات منعکس ہونے لگ جاتی ہیں۔ یہ ہے مراد اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ احکام کی اطاعت اور اسوۂ کی .... پیروی میں بنیادی فرق ہے۔ احکام کی اطاعت تو اسی نظام کی رُو سے ہوگی جس کی تشریح سابقہ صفحات میں کی گئی ہے۔ اسوۂ رسول اللہ کے معنی ہوں گے اپنے اندر ان صفات کا پیدا کرنا جن کی حسین و جمیل مظہر حضورِ رسالتمآب کی ذاتِ اقدس تھی۔ ان صفات کے حاملین کی جماعت ہی اس قابل ہوگی کہ وہ نظامِ خداوندی کو از سرِ نو قائم کر سکے۔ خدا کے وعدہ کے مطابق، قائم تو اسے بہرحال ہونا ہے۔ دیکھیں

۱؎ اگرچہ یہ آیت (جنگِ احزاب کے موقعہ پر) ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے جہاں حضورؐ نے بے حد نازک مقام پر انتہائی شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا تھا، لیکن میرے نزدیک اس کا اطلاق حضورؐ کی پوری کی پوری سیرت پر ہوتا ہے۔ حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ جس بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت کی مظہر تھی، وہ اُمّت (ہی نہیں تمام عالمِ انسانیت) کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔ اس کی پیروی اتباعِ سنّتِ رسول اللہ کہلائے گی۔

یہ سعادت کس خطۂ زمین اور کن طالع مند افراد کے حصے میں آتی ہے۔ یہ اسی سرزمین میں قائم ہو سکے گی جس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل نہ ہو۔ اس نظامِ خداوندی کی اطاعت بمنزلہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کے ہوگی۔

اس نظام میں اطاعت، قرآن کریم کے قوانین، اصول و اقدار کی ہوگی۔ ان قوانین کے نفاذ کے طور طریق اور ان اصول و اقدار کی جزئیات، اُمّت کے مشورہ سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعیّن کی جائیں گی۔ ایسا کرنے میں، روایات اور فقہ میں جو کچھ قرآن کے خلاف نہیں ہوگا اس سے بطورِ نظائر مدد لی جائے گی۔ ان کی حیثیت غیر متبدّل، ابدی قوانین کی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے 'لاتبدیل' (غیر متبدل) صرف کلمات اللہ کو قرار دیا ہے۔ خود خلافتِ راشدہ کے زمانے میں، حضورؐ کے عہد کے کئی ایک احکام میں تبدیلیاں بھی کی گئیں اور نئے احکام کا اضافہ بھی۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "شاہکارِ رسالت" میں ملے گی۔) ایسا ہی ہر نظامِ خداوندی میں ہوگا۔ جو امور (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے ہوں گے، ان میں، کسی بعد کی حکومت میں تو ایک طرف، خود اُسی حکومت کے دوران بہ تقاضائے حالات، ردّ و بدل اور حک و اضافہ کا امکان ہوگا۔ اس طرح جو قوانین و احکام قرآنی حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گے، اسلامی یا شرعی قوانین کہلائیں گے۔ حکومت کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دے دے۔

ماحصل

۱۔ اطاعت صرف خدا کی جائز ہے۔ اور کسی کی نہیں۔

۲۔ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔

۳۔ یہ اطاعت اپنے طور پر نہیں ہوگی۔ اسلامی حکومت کے ذریعے ہو سکے گی۔

۴۔ اسلامی حکومت وہ ہے جو قرآنی طریق سے وجود میں آئے اور اس کا اعلان کرے کہ اس کا فریضہ قرآنی احکام، قوانین، اقدار اور اصولوں کا نافذ کرنا ہے۔ یہ کچھ اُمّت کے مشورہ سے ہوگا۔

۵۔ اسلامی حکومت میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا، نہ محکوم۔ تمام افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری مملکت کے سر ہوگی۔ اور اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہوگی۔

۶۔ اس میں پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سب افراد یکساں بواجب التکریم ہوں گے اور حقوق و فرائض کے اعتبار سے عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

۷۔ اس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا نہ تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت)۔

۸۔ یہ ان افراد کے ہاتھوں وجود میں آئے گی جن کی سیرت، اسوۂ نبی اکرمؐ کے قالب میں ڈھلی ہوگی۔
اس سے یہ سرزمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

شاہکارِ رسالتؐ

عمر فاروقؓ

تیسرا ایڈیشن

اکثر سوالات اُبھرتے ہیں کہ

- اسلام کا معاشرتی۔ تمدنی۔ عسکری۔ سیاسی۔ معاشی نظام کیا ہے؟
- کیا یہ نظام کبھی عملی شکل میں قائم ہوا تھا؟
- اگر قائم ہوا تھا تو کب؟ ـــــ اور اس کا انداز کیا تھا؟

پھر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ

- اگر یہ نظام قائم ہوا تھا تو پھر آگے کیوں نہ چلا؟
- وہ نظام (یعنی دین) موجودہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا؟
- عجمی سازش سے کیا مراد ہے؟
- اب صحیح اسلامی نظام کے احیاء کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟

ان سوالات کا نہایت مدلّل، مستند، معقول، اطمینان بخش جواب اس کتاب میں ملے گا جو مفکرِ قرآن جناب پرویز کی مدت العمر کی تحقیقاتی کاوش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

نیز اس میں فقہ، حدیث، امامت، تصوف، کشف و الہام، دعوائے ماموریت اور ختمِ نبوت کے متعلق تاریخی مباحث اور حیرت انگیز انکشافات ملیں گے

اس کا سابقہ ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ اب تازہ ایڈیشن اسی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔

بڑے سائز کے قریب چھ سو صفحات پر مشتمل تصنیف۔ سفید کاغذ۔ جلد مضبوط مزیّن اور مطلّا ـــــ قیمت -/۷۵ روپے ـــــ ڈاک پیکنگ -/۷ روپے

ملنے کے پتے (۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر

ا۔ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی!

عدالت میں مقدمہ زیرِ سماعت ہو کوئی شخص مدعی یا مدعا علیہ کی طرف سے بطورِ وکیل پیش ہونا چاہے تو سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے پاس وکالت کی باقاعدہ سند بھی ہے۔ اگر اس کے پاس ایسی سند نہیں ہوگی تو اسے، بات کرنا تو ایک طرف، کمرۂ عدالت میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مستند وکیل بھی جب پیش ہوگا تو اسے اپنے دعوٰی کی تائید میں متعلقہ قانون کا حوالہ دینا ہوگا۔ فریقِ مخالف کے وکیل نے اس کی تردید کرنی ہوگی، تو وہ بھی قانون کے حوالے سے ایسا کر سکے گا۔ مقدمہ کی ساری بحث قانون کے حوالوں کے گرد گردش کرے گی۔

پھر قانون بھی وہ ہوگا جسے فریقین کے وکلاء اور عدالت متفقہ طور پر قانون تسلیم کریں' اس کے قانون ہونے میں نہ کوئی شک ہو نہ شبہ۔ نہ اختلاف ہو نہ دو آراء۔

اس کے بعد جب عدالت فیصلہ کرے گی تو وہ بھی قانون کے حوالے سے ایسا کرے گی۔ کسی کو اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرے۔ اگر کسی کو اس سے اختلاف ہو تو وہ اس کے خلاف بالا عدالت میں اپیل کر سکے گا۔ اور اپیل کی بنیاد بھی قانون پر استوار ہوگی۔ کسی بڑے سے بڑے وکیل (ماہرِ قانون) کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اپنے طور پر مقدمات کا فیصلہ کرنے لگ جائے۔

اسی طریقِ کار سے عدل کی عمارت استوار ہوتی ہے، اور اسی سے معاشرہ انتشار سے محفوظ رہتا ہے۔ جس معاشرہ میں تشتت و انتشار ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔

لیکن "اسلام" کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جس شخص کا جی چاہے کسی بات یا معاملہ کے متعلق "ارشاد فرمادے" کہ وہ اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ وہ بتائے کہ اس کے پاس ایسا کہنے کی اتھارٹی کیا ہے؛ نہ ہی اس کی ضرورت کہ وہ بتائے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اس کی سند کیا ہے؟ یعنی وہ کس حوالے سے کہتا ہے کہ وہ بات اسلامی ہے یا غیر اسلامی۔ وہ اتنا کہہ دینا ہی کافی سمجھتا ہے کہ "اسلام کی رُو سے یہ ناجائز ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام اسے حرام ٹھہراتا ہے۔"

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی بات کو اسلامی یا غیر اسلامی کہنے کا حق، علماء کو حاصل ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عالم (جمع علماء) کہتے کسے ہیں اور کیا ایسے شخص کو فی الواقعہ اس کا حق اور اختیار حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ جس

بات کے متعلق چاہے، اسے اسلامی یا غیر اسلامی قرار دے دے؟

کچھ لوگوں نے اپنے طور پر مذہبی درسگاہیں قائم کر رکھی ہیں۔ ابتدائی درجہ میں انہیں مکتب کہا جاتا ہے۔ منتہائی درجہ میں دارالعلوم۔ ان میں مذہب کے متعلق کچھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ نصاب بھی ان کا اپنا مقرر کردہ (بلکہ تقلیداً اختیار کردہ) ہوتا ہے۔ ایک خاص مدت کے بعد وہ طالب علموں کو سند فضیلت دے دیتے ہیں۔ انہیں علماء کہا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا وہ علم (یا معلومات) کس قسم کی ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں اس کا حق یا اختیار کیسے حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایک طالب علم وکالت کا امتحان پاس کر لینے کے بعد، از خود مقدمات کے فیصلے کرنے لگ جائے، اس بناء پر کہ اسے قانون کا علم حاصل ہے! اُسے تو اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جائے گی لیکن مذہب کی دنیا میں ایسے فیصلے کرنے والوں سے کوئی پوچھ نہیں سکے گا کہ انہیں ایسا کرنے کا حق کیسے حاصل ہو گیا ——— اور اب تو حالت یہ ہے کہ اس کے لئے کسی دارالعلوم کا فارغ التحصیل (مستند عالم) ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو بھی ذرا اچھے دار تقریر کرنا جانتا ہو، لوگوں کے کفر اور اسلام کا فیصلہ کرنے کا مجاز بن بیٹھتا ہے۔ اگر کوئی شخص ڈاکٹری کی سند حاصل کئے بغیر نسخے لکھنے شروع کر دے تو اسے (QUACK) قرار دے کر پریکٹس سے روک دیا جاتا ہے۔ لیکن مذہب ہے کہ اس میں مستند اور (QUACK) کی بھی کوئی تمیز نہیں۔ چونکہ یہ اختیار ہر ایک کو حاصل ہوتا ہے، اس لئے ایک کی تردید میں دوسرے اسی قسم کے فتوے دینے لگ جاتے ہیں۔ اس سے قوم میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، جو اکثر اوقات سر پھٹول یا مقدمہ بازی پر منتج ہوتے ہیں۔ اور تماشا یہ کہ تائید یا تردید کرنے والوں میں سے کوئی بھی اپنے مؤقف کی تائید میں متفق علیہ سند یا حوالہ پیش نہیں کرتا۔

جب اسلام (مذہب نہیں) دین تھا تو اس میں یہ حالت نہیں تھی۔ اس وقت کسی فرد کو اس کا حق حاصل نہیں تھا کہ وہ کسی بات کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کرے۔ یہ حق صرف حکومت کو حاصل تھا۔ جن عمالِ حکومت کو وہ اس کا مجاز قرار دیتی تھی، وہ (حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے) اس باب میں لب کشائی کا حق رکھتے تھے۔ عوام تو اک طرف، خواص تک بھی اس باب میں اس قدر محتاط تھے کہ ایک دفعہ امام ابو حنیفہ (علیہ الرحمۃ) کی بیٹی نے پوچھا کہ "میں آج روزہ سے ہوں۔ دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے سے نیچے اتر گیا۔ روزہ جاتا رہا یا باقی رہا ——— امام صاحب نے فرمایا کہ "جانِ پدر! اپنے بھائی حماد سے پوچھ۔ میں (حکومت کی طرف سے) فتویٰ دینے سے منع کر دیا گیا ہوں[1]" (حالانکہ وہ حکومت اسلامی نہیں تھی ——— لیکن پھر بھی یہ حضرات انفرادی افتا سے اس قدر اجتناب برتتے تھے)۔

اسی نظیر کے پیش نظر، ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت کو چاہیئے کہ جس طرح قوانینِ مملکت کے متعلق، نمائندگانِ حکومت

---

[1] سیرۃ النعمان۔ علامہ شبلی۔ حصہ اوّل۔ صـ۹۳۔

کے سوا کسی کو اس کا حق اور اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ کسی معاملہ کے قانونی یا غیر قانونی ہونے کے متعلق فیصلہ صادر کر دے، وہ مذہبی امور کے متعلق بھی اسی قسم کے احکام نافذ کر دے کہ نمائندگانِ حکومت (مثلاً شرعی عدالتوں) کے سوا کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی امر کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے متعلق فتویٰ صادر کر دے اور حکومت کے اربابِ حجاز بھی اپنے فیصلہ کی سند میں حوالہ دیں ـــــ ایسا حوالہ جو سب کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا حوالہ قرآن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا ـــــ اس سے (کم از کم) معاشرہ اس خلفشار سے بچ جائے گا جس میں وہ اس وقت مبتلا ہے۔

اور جب تک حکومت کی طرف سے ایسا اقدام نہ ہو، قوم کو چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی معاملہ کے اسلامی یا غیر اسلامی اور جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ صادر کرے، وہ اس سے مطالبہ کرے کہ وہ اپنی رائے کی تائید میں قرآنِ کریم کی سند پیش کرے۔ اس سے بھی موجودہ خلفشار کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ قوم کو بھی مناظروں کا اس قدر عادی بنا دیا گیا ہے کہ وہ اختلافی بحثوں میں بڑی لذت لیتی ہے۔ اگر وہ اپنے آپ پر اتنی سی پابندی عائد کر لے (کہ بات اس کی سنے جو اپنے مؤقف کی تائید میں قرآنی سند پیش کرے) تو وہ بڑی حد تک اس فساد کے نقصانات سے بچ جائے گی جو آجکل مذہب کے نام پر برپا کیا جاتا ہے۔ فرقہ دارانہ مسائل کے متعلق تو ہر فرقہ (لامحالہ) اپنے فرقہ کی فقہ کی طرف رجوع کرتا ہے، جن معاملات کا تعلق عام مسلمانوں سے ہو، ان میں بھی اگر، بر سبیلِ تنزل، یہ روش اختیار کر لی جائے تو اس کے نتائج خوش آئند ہوں گے۔ طلوعِ اسلام نے شروع ہی سے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ اسلامی یا غیر اسلامی کا فتویٰ صادر کرنے کے بجائے صرف اتنا بتانے پر اکتفا کرتا ہے کہ اس باب میں قرآنِ مجید کا کیا ارشاد ہے۔ اسلامی اور غیر اسلامی کا فیصلہ اس کی روشنی میں از خود ہو جاتا ہے۔

(۰)

۲۔ رشوت کیسے بند ہو سکتی ہے؟

قارئین کی طرف سے ہمارے پاس جو استفسارات آتے ہیں ان میں نصف سے زیادہ کا تعلق اس سوال سے ہوتا ہے کہ رشوت کیسے بند ہو سکتی ہے؟ رشوت ستانی کے خلاف افرادِ معاشرہ ہی نوحہ کناں نہیں۔ اربابِ نظم و نسق بھی اکثر و بیشتر یہ رونا روتے ہیں، لیکن اس کی روک تھام کے لئے ایسے ہی بے بس نظر آتے ہیں، جیسے برسات کے دنوں، دریاؤں کے سیلاب پر قابو پانے میں۔ اس سلسلہ میں تجاویز بھی اکثر پیش ہوتی رہتی ہیں لیکن اوّل تو ان پر عمل ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ـــــ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ـــــ یہ اس لئے کہ یہ تجاویز علاماتِ مرض کا علاج سوچتی ہیں۔ علتِ مرض کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا۔

پرویز صاحب اپنی ملازمت کے تجربات ابھی تک ضبطِ تحریر میں نہیں لائے۔ لیکن رشوت ختم کرنے کے سلسلہ میں وہ ایک واقعہ کا ذکر کیا کرتے ہیں جو فی الحقیقت اس مرض کی صحیح تشخیص بھی ہے، اور مؤثر علاج

بھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس طرح ایک مؤثر مہم کے بعد ہمارے ملک سے چیچک کے مرض کا نام و نشان تک مٹ گیا ہے، اس طرح اس علاج سے رشوت جیسے مہلک ترین مرض کے امکانات تک ختم ہو سکتے ہیں۔ اور وہ واقعہ انہی کے الفاظ میں یوں ہے:-

تقسیمِ ہند کے بعد جب دفاتر کراچی آئے، تو حکومتِ پاکستان نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ ملازمینِ حکومت کے لئے تنخواہوں کے سکیل متعین کرنے کی سفارشات کرے۔ (جسٹس) محمد منیر (مرحوم) اس کمیشن کے چیئرمین تھے، سیکرٹریٹ کے ملازمین کے امور ملازمت کا تعلق مجھ سے تھا۔ کمیشن نے، اس حیثیت سے مجھے بھی شہادت کے لئے بلایا۔ وہاں حسبِ ذیل سوال و جواب ہوئے:

سوال:- آپ کے خیال میں سیکرٹریٹ کے ملازمین کی تنخواہوں کا سکیل کیا ہونا چاہیئے!

جواب:- سوال یہ نہیں کہ آپ کے خیال میں یا میرے خیال میں یہ سکیل کیا ہونے چاہئیں۔ یہ خیال کی بات نہیں، یہ واقعاتی مسئلہ ہے۔ لہٰذا، ہمیں سوچنا اور فیصلہ یہ کرنا چاہیئے کہ درحقیقت ان کی تنخواہیں کیا ہونی چاہئیں اور ان کے تعین کا معیار کیا۔

سوال:- تو پھر آپ ہی بتایئے کہ فی الحقیقت یہ سکیل کیا ہونے چاہئیں؟

جواب:- جب کوئی شخص پہلے پہل ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایک عہدنامہ کا فارم پُر کرنا ہوتا ہے جس میں (منجملہ دیگر امور) لکھا ہوتا ہے کہ میں چوبیس گھنٹے کا ملازمِ سرکار ہوں۔ اور دورانِ ملازمت میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے مجھے کچھ آمدنی ہو۔ (معلوم نہیں کہ اب بھی ایسا فارم پُر کرایا جاتا ہے یا نہیں۔ اس زمانے میں ایسا فارم ہوتا تھا۔ یہ فارم اس وقت بھی ہو یا نہ ہو، اس قسم کی قانونی پابندی بہرصورت اب بھی ہے)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد، ملازمِ سرکار کا (جائز) ذریعہ آمدنی صرف اس کی تنخواہ ہوتی ہے۔ اس میں اسے اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنی ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس کی تنخواہ اتنی ہونی چاہیئے جس میں اس کی اور اس کے ان متعلقین کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں جن کی کفالت اس کے ذمے ہے۔

سوال:- اس کا تعین کس طرح سے ہو؟

جواب:- یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ حضرات گھر بار والے ہیں۔ اس لئے آپ کو معلوم ہے کہ ایک گھرانے کی ضروریاتِ زندگی کیا ہوتی ہیں۔ ایک نوگرفتار ملازم کے گھرانے کے کم از کم افراد (میاں، بیوی۔ دو بچے) بنیاد بنا کر، ضروریات کی فہرست لے کر بازار چلے چلتے ہیں اور اشیائے ضروریہ کی قیمتیں معلوم کر لیتے ہیں۔ ان میں تعلیم، علاج وغیرہ کے اخراجات شامل کرنے کے بعد، جو میزان ہو، وہ اس کی ابتدائی تنخواہ ہونی چاہیئے۔ جس نسبت سے اس کے افرادِ خاندان اور ان کی ضروریات میں اضافہ ہو، اسی نسبت سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوتے چلے جانا چاہیئے۔ اسے اس کی تنخواہ کا سکیل کہہ لیجئے۔

سوال :۔ تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ملازمین کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے سر پر لے! یہ تو مشکل ہے۔

جواب :۔ حیرت ہے کہ حکومت، قیدیوں کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری تو اپنے سر پر لیتی ہے کیونکہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہوتا۔ لیکن اپنے ملازمین کا پورا وقت خرید کر اور ان پر دیگر ذرائع آمدنی کے دروازے بند کر کے، ان کی ضروریات کی ذمہ داری اپنے سر پر نہیں لے سکتی! سوچیئے کہ اگر حکومت ایسا نہیں کرتی اور انہیں اتنا نہیں دیتی کہ وہ اس سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کر سکیں، تو وہ سانپ کے بچے تو ہیں نہیں کہ مٹی کھا کر گذارہ کر لیں گے! وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیگر (خلافِ قانون) ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے!

کمیشن :۔ بہت اچھا۔ ہم اس پر غور کریں گے اور آپ کو دوبارہ تکلیف دیں گے۔ آپ کا شکریہ!

پرویز صاحب نے بتایا کہ اسی شام ان کے سیکرٹری نے (جو ایک انگریز تھا) انہیں بلایا اور کہا کہ "تم نے کمیشن سے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا کہ کیوں؟ کیا بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ کمیشن نے کہا ہے کہ "آپ لوگوں نے شہادت کے لئے کس شخص کو بھیج دیا، وہ تو کمیونسٹ ہے"؟ میں نے سیکرٹری کو اپنی "کمیونزم" کی روئداد سنائی تو وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ پھر تو کمیشن سچ کہتا ہے!

اس کے بعد کمیشن نے مجھے "تکلیف نہ دی" اور اس کے تجویز کردہ سکیل کی رُو سے کلرک کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد، انسدادِ رشوت ستانی کا محکمہ وجود میں آ گیا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ان "سانپ کے بچوں" اور "سپیروں" میں ریس چلی آ رہی ہے۔ رشوت سیلاب کی طرح بڑھ رہی ہے اور اسی نسبت سے اس کے انسداد کے عمل میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے قیامت تک رشوت ستانی کا انسداد نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ علتِ مرض کا علاج نہیں۔ علتِ مرض کا علاج یہ ہے کہ حکومت، اپنے ملازمین اور ان کے متعلقین کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری لے۔ اور یہ ذمہ داری ان کی مدتِ ملازمت کے دوران تک ہی نہ ہو بلکہ ملازمت کے بعد بھی، جب تک ان کے ذرائع آمدنی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے مکتفی نہ ہوں، یہ ذمہ داری جاری رہے۔ حکومت یہ کرے اور اس کے بعد اگر کوئی ملازم، ناجائز طریق سے ایک پیسہ بھی حاصل کرے، تو اُسے خواہ مخواہ پھانسی کے تختے پر لٹکا دے!

پرویز صاحب کہتے ہیں کہ میں نے جو تجویز کمیشن کے سامنے پیش کی تھی وہ میرے ذہن کی اختراع نہیں تھی۔ وہ قرآن کریم کی تجویز فرمودہ تھی۔ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رُو سے، معاشرہ کے جملہ افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر عائد ہوتی ہے (اور ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت ان میں سرفہرست ہوں گے) اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کے جو تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے انہیں حضورؐ نبی اکرمؐ نے نہایت دلنشیں انداز میں، ایک مثال کے ذریعہ یوں سمجھایا ہے کہ:

کچھ لوگ ایک کشتی پر سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصّے میں پہنچ گئے۔ کچھ نیچے کے

حصے ہیں۔ جو نچلے حصّے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو انہوں نے انہیں پانی لینے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا! ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ اوپر اور نیچے والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر روک دیا جائے تو یہ سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

پیاسے کا علاج پانی ہے۔ کوڑے نہیں۔ رشوت ہی نہیں۔ جملہ معاشی فسادات کا علاج قرآن کا معاشی نظام ہے۔ دنیا جو چاہے کر کے دیکھ لے۔ اسے آخر الامر یہی نظام اختیار کرنا پڑے گا۔

(۰)

۳۔ سود پر زکوٰۃ

ایک صاحب نے کہا ہے کہ وہ نیشنل ڈیپازٹ سرٹیفکٹ بھنانے کے لئے نیشنل سیونگز کے دفتر میں گئے تو انہوں نے اصل + سود (کل رقم) پر زکوٰۃ کاٹ کر بقایا انہیں ادا کی۔ انہوں نے کہا کہ صدرِ مملکت نے تو فرمایا تھا کہ زکوٰۃ صرف اصل رقم پر کاٹی جاتی ہے۔ سود پر نہیں۔ اور آپ سود پر بھی زکوٰۃ کاٹ رہے ہیں، تو سیونگز والوں نے کہا کہ ان کے پاس احکام وہی ہیں جن کے مطابق وہ اصل اور سود دونوں کی مجموعی رقم پر زکوٰۃ کاٹتے ہیں۔

طلوعِ اسلام

صدرِ مملکت کے جس بیان کا حوالہ انہوں نے دیا ہے وہ یوں ہے کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ بینک، اصل اور سود دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ کاٹتے ہیں، تو انہوں نے فرمایا:۔

یہ کہنا قطعی پراپیگنڈہ ہے کہ حکومت نے زکوٰۃ، سود کی رقم سے کاٹی ہے۔ صدرِ پاکستان نے کہا کہ بینکوں نے زکوٰۃ کل رقم میں سے نہیں بلکہ اصل رقم میں سے کاٹی ہے۔

(روزنامہ جنگ، راولپنڈی۔ مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۸۰ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت ستمبر ۱۹۸۰ء۔ صـ۴۶)

صدرِ محترم کا ارشاد یہ ہے اور بینکوں کا عمل وہ!

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

صدرِ مملکت نے ۲۵ر جون ۱۹۷۸ء کو قوم کے نام ایک تقریر نشر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا:۔

بعض حلقوں میں جو قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ بینکوں میں جمع رقوم پر زبردستی زکوٰۃ لی جائے گی، وہ سراسر غلط ہے۔ (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۷۸ء)

اور بینکوں میں جمع شدہ رقوم پر زکوٰۃ زبردستی لی جاتی ہے!

اسلام تو خیر بہت بعد کی بات ہے۔ جو کچھ عملاً ہو رہا ہے وہ خود صدرِ مملکت کے اقوال کے بھی خلاف ہے!

(۰)

۴۔ "دو بئی چلو" — ایک نیا نفسیاتی مرض

ہم نے طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۸۲ء میں، مسلم ممالک میں جانے والے پاکستانیوں کی سیلابی کھیپ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان نو دولتیوں کی ذہنیت میں جو نہایت ناخوش آئند تبدیلی آجاتی ہے، اس نے ہمارے معاشرہ کو تہ و بالا کر دیا ہے اور اس کے نتائج بڑے دُور رس اور مہلک ہوں گے۔ اسے حسنِ اتفاق کہیئے کہ انہی دنوں ملک کے معروف نفسیاتی معالج، ڈاکٹر مبشر ملک کی ایک تازہ تصنیف "نفسیاتی و ذہنی امراض" کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس کی تقریبِ رونمائی پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ جنگ (لاہور) کی میگزین ایڈیشن بابت ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء میں لکھا ہے:۔

> ڈاکٹر مبشر ملک ذہنی و نفسیاتی امراض کے معروف معالج ہیں۔ وہ کوئی دو درجن بین الاقوامی اداروں کے رکن ہیں۔ ان کی کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ انہوں نے جو جدید نفسیاتی امراض بتائے ہیں ان میں سے ایک مرض کا نام "دو بئی چلو" بھی ہے۔ اس مرض سے معاشرہ میں جو اتھل پتھل ہو رہی ہے اس کے نتائج ہولناک ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے راولپنڈی کی ایک تقریب میں کہا:۔

> بیرونِ ملک جانے کے شدید خواہشمند اور بیرونِ ملک یا وطن واپسی پر ماحول سے عدمِ مطابقت کا شکار لوگ بکثرت ذہنی امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ (جنگ لاہور۔ ۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء)

(ضمناً۔ ڈاکٹر صاحب جنرل ہسپتال، راولپنڈی کے شعبۂ امراضِ نفسیات کے سربراہ ہیں)

طلوعِ اسلام میں شائع ہونے والے تبصرہ سے قوم اور حکومت کی توجہ کا اسی نفسیاتی مرض اور اس کے ہولناک نتائج کی طرف مبذول کرانا مقصود تھا کہ کسی کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!

(۰)

۵۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد!

آپ کو یاد ہوگا کہ تحریک "پاکستان قومی اتحاد" (۱۹۷۷ء) جو نظامِ مصطفےٰ کا نعرہ بلند کر کے، طوفان کی طرح اٹھی لیکن آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ رفیق احمد باجوہ صاحب اس کے سیکرٹری جنرل تھے۔ وہ تحریک کے دوران، اس سے الگ ہو گئے تھے، یا الگ ہونے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا تھا، اس کے متعلق وہ اتنا عرصہ بالکل خاموش رہے۔ اب روزنامہ جنگ (لاہور) کی (۱۹) نمایت (۲۵) مارچ کے میگزین ایڈیشن میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اس راز پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اسے آپ انہی کے الفاظ میں پڑھئے

اور پھر سوچئے کہ نظامِ مصطفٰے کے قیام کا دعوٰے لے کر اٹھنے والوں کا کردار کیا تھا؟ باجوہ صاحب سے کہا گیا کہ وہ اس قصّے کی تفصیل بتائیں تو انہوں نے کہا:۔

تفصیل اگر آپ ضرور چاہتے ہیں تو یہ ہے کہ ۷ مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات سے چند روز پیشتر یہ خبریں مجھ تک پہنچیں یا ہو سکتا ہے کہ عمداً پہنچائی گئیں تاکہ میں بددل ہو کر علیحدہ ہو جاؤں یا غصّے میں آ کر عوام کو سب کچھ بتا دوں جو ظاہر ہے کہ اس وقت کسی طرح بھی مفید نہ تھا۔ بہرحال اطلاعات یہ تھیں کہ پاکستان قومی اتحاد کے رہنماؤں کی اکثریت نے سربراہِ حکومت سے سودے بازی کر لی ہے۔ حکومت ان سربراہوں کے انتخابات میں کامیابی کے راستے میں حائل نہ ہو گی انہیں اپنے اپنے حلقوں سے کامیاب ہونے دیا جائے گا۔ اس کے صلے میں قومی اتحاد کے رہنما قومی جذبات کو حکومت کے خلاف بڑھنے نہیں دیں گے بلکہ ان جذبات کو ٹھنڈا کر کے تحریک کو ختم کر دیں گے۔ حکومت کے خلاف کوئی تحریک نہیں چلائی جائے گی۔ میں نے ان باتوں پر کوئی یقین نہیں کیا۔ بلکہ انہیں مخالف کیمپ کا پروپیگنڈہ سمجھ کر غلط جانا۔ لیکن جب ۷ مارچ کے قومی اسمبلی کے انتخابی نتائج سامنے آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں سوچنے لگا کہ ان سب رہنماؤں کا کامیاب ہو جانا اور ان کے دیگر ساتھیوں کا دھاندلی کی وجہ سے ناکام ہو جانا خالی از علّت نہیں ہے۔ وہ دھاندلی جو اتحاد کے دیگر امیدواروں کے سلسلے میں روا رکھی گئی اس سے اتحاد کے یہ رہنما کیسے محفوظ رہے حالانکہ یہ اس حکومت کے صفِ اوّل کے دشمن تھے۔ ان کے حلقہ ہائے انتخابات میں تو بے مثال قسم کی دھاندلی ہونی چاہیئے تھی۔ کیونکہ سربراہِ حکومت کو قدرتی طور پر ان رہنماؤں کا قومی اسمبلی میں موجود ہونا ناپسند تھا۔

مجھے ان اطلاعات پر یقین آنے لگا جو اس سے پہلے ہی مجھے مل چکی تھیں۔ اس روز یہ تمام رہنما اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخابات میں موجود تھے۔ لاہور میں میرے اور میاں طفیل محمد کے سوا کوئی رہنما موجود نہیں تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ قومی اتحاد دس مارچ کے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کرتا ہے اور قومی اسمبلی کی حاصل کردہ نشستیں بھی واپس کرتا ہے۔ یہ اعلان اور فیصلہ میرا اور میاں طفیل محمد کا تھا۔ بنیادی طور پر میری اور میاں صاحب کی نیت ایک تھی۔ لیکن میرے دل میں جذبۂ انتقام بھی موجود تھا۔ میں اس طرح رہنماؤں کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تم آمریت کے خلاف قومی تحریک کو کسی سودے بازی کے ذریعے نہیں روک سکتے اور اگر تم سودے بازی کرنا جانتے ہو تو ہم تمہارے سودے بازی کے منصوبے کو ناکام بنانے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ اتفاق کریں کہ اس سے بڑا سیاسی فیصلہ اور صحیح سیاسی عمل پاکستان کی سیاسی تاریخ میں نہ ہوا نہ اس وقت تک ہوا تھا۔ اور نہ شاید آئندہ ہو سکے گا۔ یہی وہ بروقت فیصلہ تھا جس نے اس سودے بازی کو ناکام بنایا اور سودے اور سودے بازی کرنے والے عوامی جذبات کی تاب نہ لاتے ہوئے ایک دوسرے کے مدِمقابل آ گئے قوم کی خواہشات کے خلاف ان کا کوئی خفیہ منصوبہ

کامیاب نہ ہو سکا۔

لب پر نظامِ مصطفےٰ کا مقدس نعرہ اور کردار یہ! اس تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ!!

(۰)

۶۔ قادیانیوں کو غیر مسلم کب قرار دیا گیا تھا؟

اخبار جنگ (لاہور) کی جمعہ میگزین ایڈیشن میں (جو مارچ کی کسی تاریخ کو شائع ہوا تھا لیکن اس پر تاریخ نہیں دی گئی۔ اخبارات اپنے میگزین ایڈیشن پر عام طور پر تاریخ نہیں دیتے) یہ خبر شائع ہوئی ہے:۔

حال ہی میں مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم الاسلامی کے تحت، رسالۃ المسجد کی ساتویں سالانہ کانفرنس ہوئی۔ اس میں مندرجہ ذیل دو قراردادیں منظور کی گئیں:۔

۵۔ مجلس نے صدرِ پاکستان کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔

قادیانیوں (اور لاہوری احمدیوں) کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا قانون، پاکستان کی پارلیمان نے ۱۹۷۴ء میں آئینی ترمیم کی رُو سے پاس کیا تھا۔ اور موجودہ صدرِ پاکستان ۱۹۷۷ء میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ سنا ہے کہ پاکستان سے میاں طفیل محمد اس کانفرنس میں شریک تھے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے بھی اس تاریخی غلطی کی طرف کانفرنس کی توجہ مبذول نہ کرائی! اس قسم کے تضاد آنے والے مؤرخوں کے لئے جس قدر وجہِ پریشانی ہوتے ہیں اس سے تاریخ، حقیقت کشا ہونے کے بجائے افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔

(۰)

۷۔ پیدائش کی رو سے طبقاتی امتیازات!

روزنامہ جنگ (لاہور) کی اشاعت بابت یکم فروری ۱۹۸۲ء میں حسبِ ذیل خبر چھپی ہے:۔

لاہور ۳۱ جنوری (سٹاف رپورٹر) مقامی مجسٹریٹ ملک بشیر احمد اعوان نے ایک ملزم عبداللہ کو اپنی سوتیلی لڑکی حلیمہ بی بی کے ساتھ زیادتی کرنے پر سات سال قید بامشقت کی سزا کا حکم سناتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ حلیمہ ایک سادات خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ویسے بھی سادات خاندان کو اس معاشرے میں اہم مقام حاصل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سادات خاندان کی لڑکی سے اس قسم کی زیادتی ایک نیچ شخص نے کی ہے جو کہ موالی ہے اور جو نہ صرف اللہ تعالےٰ کا مجرم ہے بلکہ معاشرے میں بھی اسے اس قسم کی زیادتی کرنے کے بعد رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

جرم کی سزا اپنی جگہ ــــ لیکن فاضل مجسٹریٹ نے ذاتوں کے امتیاز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سلسلہ میں یہ سوچنا پڑے گا کہ اس کے بعد،

(۱) قرآن کریم کی اس قسم کی آیات: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ ..... (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے"۔

(۲) حضورؐ نبی اکرمؐ کے اس قسم کے ارشادات کہ "یاد رکھو! تم سب ایک باپ (آدم) کی اولاد ہو۔ اس لئے کالے کو گورے پر، عرب کو عجمی پر کسی قسم کی فضیلت حاصل نہیں، بجز تقویٰ کے، (خطبۂ حجۃ الوداع)۔ اور

(۳) صدرِ اوّل کی تاریخ کے اس قسم کے درخشندہ واقعات کہ، ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت حمیرؓ بن سعد کے منہ سے کسی ذمی (غیر مسلم رعایا کے فرد) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ـــــ اخزك الله ـــــ "خدا تجھے رسوا کرے"۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر استعفیٰ دے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں کہ میں نے ایک انسان کی تذلیل کی ہے۔ (شاہکارِ رسالت ص۲۲۵)

اِس کی تاویل کیا کی جائے گی اور یہ جو ہم آئے دن مساواتِ انسانیہ کا دعوےٰ کرتے ہیں، اس کا مفہوم کیا لیا جائے گا؟

(۰)

۸۔ تعزیراتی قوانین

صدرِ مملکت، جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ۲۵ جون ۱۹۷۸ء کی شب، قوم سے خطاب کرتے ہوئے ایک تقریر نشر فرمائی تھی جس میں، منجملہ دیگر امور، کہا تھا کہ

> بعض حلقوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سزائیں نافذ کرنے میں تو دیر نہیں لگتی۔ کم از کم انہیں بھی نافذ کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تقاضوں کو پورا کئے بغیر اسلامی سزائیں نافذ کرنا خود اسلام کے خلاف زیادتی ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی معاشی، تعلیمی، عسکری، معاشرتی، غرضیکہ جملہ اجتماعی ضرورتوں کا احاطہ کرتا ہے اور اسلامی سزائیں اسلام کے اس اجتماعی نظام کا صرف ایک حصّہ ہیں۔ سزاؤں کا نفاذ اسلام کے اجتماعی نفاذ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ انہیں الگ طور پر نافذ کرنا مناسب نہ ہوگا۔
>
> (طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۷۸ء۔ ص۱۵)

یہ جون ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ اور فروری ۱۹۷۹ء میں "اسلامی سزاؤں" سے متعلق آرڈی نینس جاری کر دیا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ، اور تو اور، خود صدرِ مملکت شکوہ سنج ہیں کہ ان پر عمل نہیں ہو رہا۔ حتّٰی کہ وہ انہیں ناممکن العمل قرار دے رہے ہیں۔

اب خبر عام ہو رہی ہے کہ جرمِ قتل وغیرہ کے سلسلہ میں سزاؤں سے متعلق آرڈی نینس بھی عنقریب نافذ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا حشر بھی پہلے آرڈی نینس سے مختلف نہیں ہوگا۔

ضمناً۔ جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں، ان قوانین کو "اسلامی" کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔ یہ فقہی قوانین ہیں جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مدوّن ہوئے تھے۔ ان کی حیثیت ابدی اسلامی قوانین کی

نہیں۔ اسلامی قوانین وہ ہو سکتے ہیں، جنہیں ایک اسلامی مملکت، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کرے۔ فقہی قوانین جو یہاں نافذ کئے جا رہے ہیں، ان میں سے کسی شرط کو بھی پورا نہیں کرتے۔

(o)

۹۔ قرآن کا گمراہ کُن استعمال!

روزنامہ ڈان (کراچی) کی ۱۹ر فروری ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں، عبد القدوس شیخ صاحب کا ایک مقالہ (بلکہ انٹرویو) شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ انگلینڈ سے ایک "شاہ صاحب" (سعید اختر شاہ نامی) تشریف لائے ہیں جو قرآن آیات کے ذریعے جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے بقول، وہ سہارن پور (انڈیا) کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں حوالدار تھے۔ وہاں چل نہ سکے تو ملازمت چھوڑ دی۔ ذریعہ معاش کوئی نہ تھا۔ مراقبہ کے عالم میں انہیں ایک رات "حکمِ الٰہی" ملا کہ وہ مغرب (یورپ) چلے جائیں۔ اس کے لئے غیب سے کچھ انتظام بھی ہو گیا اور وہ لندن چلے گئے۔ وہاں انہوں نے، قرآنی آیات کے ذریعے جسمانی امراض کا علاج کرنے کا "آرٹ" شروع کیا۔ (یہ خود انہیں کے الفاظ ہیں) انہوں نے وہاں (JAMIAT – AL – SAFINATA) کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے۔

شاہ صاحب، یا اسی قماش کے دیگر حضرات کو کون روک سکتا ہے کہ وہ قرآن کو اس طرح بدنام نہ کریں۔ جو کچھ وہ کہتے (یا کرتے) ہیں، اس میں قرآنی آیات کی کوئی خصوصیت نہیں۔ وہ (ہپناٹزم کے انداز کا) فن (آرٹ) ہے جس میں کوئی سے الفاظ دُہرانے سے مطلوبہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ پرویز صاحب نے اپنی حالیہ شائع شدہ تصنیف، تصوّف کی حقیقت، میں اس قسم کے تمام "رموز و اسرار" کی نقاب کشائی کر دی ہے۔ قرآنِ کریم ایک ضابطۂ حیات، نظامِ زندگی عطا کرتا ہے جو انسانیت کے جملہ امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ جسمانی امراض نہیں، بلکہ سیرت و کردار کے امراض کو شفا بخشتا ہے۔ اسے اس قسم کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا، اسے اس کے ارفع و اعلیٰ مقام سے گرا کر توہم پرستی کے پست ترین مقام پر لے آنا ہے جو عدالتِ خداوندی میں سنگین ترین جرم ہے۔ (کم از کم) قوم کے اربابِ دانش و بینش کو تو اس قسم کے جرم کی اعانت کا مجرم نہیں بننا چاہئیے۔

(o)

۱۰۔ بصیرت واپس آ گئی!

پچھلے دنوں صدرِ مملکت، جنرل ضیاء الحق صاحب نے وصیت کی کہ ان کی وفات کے بعد ان کی آنکھیں، بطور عطیہ، کسی نابینا کو بینائی عطا کرنے کے لئے، ان کے (مردہ) جسم سے نکال لی جائیں۔ اس قسم کے عطیات کے مستحسن اور اسلام کے منشا کے مطابق ہونے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ قرآنِ کریم تو "عملِ صالح" کا معیار ہی یہ

قرار دیتا ہے کہ

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ... ۝ (۱۳/۱۷)

بقا اسی عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

لیکن اسلام اگر اس قدر سیدھا اور صاف ہو جائے تو مذہبی پیشوائیت کے وجود کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ بحث چھڑ گئی کہ ایسی وصیت، از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ یہ مسئلہ پہلی بار سامنے نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے، مودودی صاحب (مرحوم) کے زمانے میں بھی یہ زیرِ بحث آیا تھا اور انہوں نے اسے ناجائز قرار دیا تھا۔ بہرحال، بحث چلی۔ ظاہر ہے کہ ایسے اہم معاملہ میں، اسلامی نظریاتی کونسل کے سپریم جسٹس تنزیل الرحمٰن کس طرح خاموش رہ سکتے تھے؛ چونکہ ان کا مقام، دیگر مفتی صاحبان کے مقابلہ میں بہت بلند ہے اس لئے، انہوں نے اس پر طویل ترین مقالہ سپردِ قلم فرمایا۔ اس کی طوالت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ پاکستان ٹائمز جیسے اخبار کی دو بھرپور اشاعتوں (بابت ۲۸ جنوری و ۱۱ فروری ۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے پہلے متقدمین اور متاخرین علماء کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ ایسی وصیت شرعاً جائز نہیں۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ

> میں نے بھی اس سے پہلے، اپنی کتاب "مجموعۂ قوانینِ اسلامی" (جلد چہارم۔ شائع شدہ ۱۹۷۳ء) میں اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ ایسی وصیت شرعاً جائز ہے۔ لیکن اس کے بعد، مسلم ممالک کے بعض علماء کی ریسرچ کی روشنی میں، میں نے اس مسئلہ پر مزید غور کر کے اپنے سابقہ خیال سے رجوع کر لیا۔ اب میرے خیال میں اس قسم کی وصیت جائز ہے۔ (ملخصاً)

یہ ہمارے ہاں کے "مفتیٔ اعظم" کے فتوے کی حیثیت ہے کہ جو عمل ۱۹۷۳ء میں شرعاً ناجائز تھا، وہ ۱۹۸۲ء میں جائز قرار پا گیا۔ اور قوم سے بزورِ قانون منوایا یہ جا رہا ہے کہ جو فقہی فتاویٰ ہزار سال پہلے صادر ہوئے تھے وہ ابدی طور پر غیر متبدل رہیں گے!

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے!!

(۰)

۱۱۔ اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے!

طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل (۱۹۳۸ء) کی بات تو شاید دور کی سمجھی جائے، تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے اسی آواز کو پھر بلند کیا جس پر مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی۔ یعنی یہ کہ قرآن کریم ہمارا آئینِ حیات اور ضابطۂ زندگی ہے۔ اسی کی حدود و شرائط کے مطابق دستورِ پاکستان مرتب ہوگا اور انہی خطوط پر ہمارا ضابطہ، قوانین مدوّن۔ اسی مرکز کے ساتھ تمسک سے، یہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی قوم، پھر سے ملّتِ واحدہ بن سکے گی اور اسی سے وہ نظام قائم ہو سکے گا جس میں، ہماری ہی نہیں، تمام نوعِ انسان کی مشکلات کا حل پوشیدہ ہے۔

یہ آواز بلند کرنا تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کے خلاف مخالفت کا طوفان برپا کر دیا گیا ــــ یہ ملحد ہے، بے دین ہے۔ کافر ہے۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہے ــــ پرویز صاحب کے خلاف ایک ہزار "علماء" کی طرف سے کفر کے فتوے پر دستخط کرائے (یا بالفاظِ صحیح انگوٹھے لگوائے) گئے۔ جرم اس کا کیا تھا۔ اسے اس واقعہ کی رُو سے سمجھئے کہ مودودی صاحب (مرحوم) نے کہا کہ اسلام میں غلام اور لونڈیوں کی اجازت ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری نے قرآنی آیات کی رُو سے ثابت کیا کہ اسلام میں غلامی بکسر ممنوع ہے۔ مودودی صاحب (مرحوم) کے پاس ان آیات کا جواب کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ

مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صـ۲۹۲)

اسی طرح جب طلوعِ اسلام میں قرآنی اسناد سے یہ ثابت کیا گیا کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کے ترکہ سے حصہ مل سکتا ہے، تو مودودی صاحب (مرحوم) نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ لوگ ٹیڑھی ذہنیت کے خبطی ہیں" (ترجمان القرآن۔ بابت جون۔ جولائی ۱۹۵۲ء)۔

ان کے اس زمانے کے دستِ راست اور بعد کے منحرف) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ایک قدم آگے بڑھے اور یہ فتویٰ صادر فرما دیا کہ جو شخص اسلامی شریعت کو صرف قرآن میں محصور سمجھتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ (روزنامہ تسنیم، لاہور، مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء بحوالہ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۵۲ء۔ صـ۶۳)۔ چونکہ ہماری مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں پراپیگنڈے کی ایسی وسیع اور منظم مشینری ہے جس کی مثال دنیا کی بڑی سے بڑی مملکت میں بھی نہیں ملتی۔ اس لئے اس کی طرف سے مخالفت، چاروں طرف سے یورش کر کے اُمنڈتی ہے، جس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی صبر آزما ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا سر نیاز بارگاہِ ایزدی میں قدم قدم پر جھک جاتا ہے کہ اس نے ہمیں اس کی ہمت، حوصلہ اور جرأت عطا فرمائی کہ مخالفتوں کی اس یلغار میں ہمارے پائے استقامت میں کبھی اور کہیں لغزش نہ آئی اور ہم قرآن کی آواز کو مسلسل اور متواتر بلند کرتے چلے آئے۔ خلقے پسِ دیوانہ و دیوانہ بکارے ــــ

ــــ اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ اب ہر منبر و محراب سے قرآن کا نام سنائی دیتا ہے۔ قرآنی سمینار۔ قرآنی کانفرنسیں۔ قرآنی مذاکرات منعقد ہوتے ہیں۔ جرائد اور مجلات کے قرآنی نمبر شائع ہوتے ہیں۔ اور تو اور، (نام کے اعتبار سے کالعدم جماعت اسلامی کے آرگن) ہفت روزہ "ایشیا" نے بھی (۲۲ مارچ ۱۹۸۳ء کو) قرآن نمبر شائع کیا ہے۔ اس کے ٹائیٹل پر رنگین طباعت میں ثبت ہے کہ

صرف دو آدمی قابلِ رشک ہیں۔ ایک وہ جسے اللہ تعالےٰ نے قرآن کا علم دیا اور دن رات اس کی تعلیم و تبلیغ میں مصروف ہو۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالےٰ نے مال دیا اور وہ شب و روز اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہو۔ (فرمانِ رسولؐ)

اور یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

خبردار ہو جاؤ۔ کتاب اور اقتدار الگ الگ ہو جائیں گے لیکن تم کتاب سے الگ نہ ہو جاؤ۔ (صـ۱)

اور مودودی صاحب (مرحوم) کی ایک تقریر بھی جس میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ

ہمارا یہ ملک جس مقصد کے لئے قائم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ہم یہاں قرآن کا قانون نافذ کریں گے۔ پاکستان یہی کہہ کر قائم کیا گیا تھا اور اس دعویٰ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا کہ صدیوں کے بعد ہم یہاں اسلامی نظامِ حیات کی پہلی تجربہ گاہ قائم کر رہے ہیں تاکہ دنیا اسے دیکھے اور اس سے روشنی حاصل کرے لیکن پچھلے بائیس سال کے دوران میں بجائے اس کے کہ یہاں قرآن کے قانون کو نافذ کیا جاتا۔ قرآن کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کیا جاتا۔ کوشش یہ کی گئی کہ لوگوں کے اندر قرآن سے اور زیادہ انحراف پیدا ہو۔[1] (ص ۱۶)

یہ تو تھا ایشیا کا قرآن نمبر۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امسال خود منصورہ (لاہور) میں، (شروع اپریل میں) "پیغامِ قرآن کانفرنس" منعقد ہوئی ہے ——— آپ نے غور فرمایا کہ یہ خبر جس قدر غیر متوقع ہے اسی قدر مسرت خیز بھی ہے۔ ہم اس پر درگاہِ رب العزت میں جس قدر سجداتِ شکرانہ بھی ادا کریں کم ہیں۔

'جاں ندر اپنی بھول گیا اضطراب میں'

اس کانفرنس میں میاں طفیل محمد صاحب نے (اپنے صداراتی کلمات میں) فرمایا کہ

پاکستان اسلامی نظام کے لئے قائم ہوا تھا اور قائدِ اعظمؒ نے اپنی درجنوں تقریروں میں بار بار یہ بات کہی کہ پاکستان کا قانون قرآن و سنت[2] پر مبنی ہوگا۔

(روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ ص ۸۔ مورخہ ۲ اپریل ۸۲ء)

آپ فرماتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نے بار بار یہ بات کہی تھی، اور مودودی صاحب، تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کہتے تھے کہ

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم۔ ص ۳۲-۱۳۱)

بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (ص ۳۶)

ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں

---

[1] اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ..... اس موضوع پر ہم بڑی تفصیل سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔

[2] انہوں نے صرف قرآن کہا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ (جیسا کہ خود مودودی صاحب (مرحوم) کو ۱۹۷۰ء میں ..... اعتراف کرنا پڑا تھا) "قرآن و سنت" کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے سب اسلامی تسلیم کر لیں۔"

خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ (ص۲۷)

میاں صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

قائدِ اعظمؒ نے سٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر یہ بات کہی تھی کہ پاکستان میں اسلام کا معاشی نظام قائم کیا جائے گا۔ (روزنامہ جنگ مذکورہ۔ ص۷)

مودودی صاحب (مرحوم) .... کے نزدیک، اسلام کے معاشی نظام سے مراد کس قسم کا نظام ہے، اس کی تصریح خود مودودی صاحب نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں ان الفاظ میں کی ہے:

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے، یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بے کار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین۔ پہلا ایڈیشن۔ ص۵۲-۵۳)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں:

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز[1] ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز[2] راستے سے آئے، ناجائز طریقے پر استعمال نہ ہو۔ جائز[3] راستوں میں جائے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق[4] اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ

---

[1]، [2]، [3] جائز سے مراد ہے اس قانونِ شریعت کی رُو سے جائز جو اس نظامِ سرمایہ داری کے دور کا وضع کردہ ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[4] یہ حقوق صدقہ، خیرات (اور اب مروجہ زکوٰۃ) کی رُو سے ادا ہو جاتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

> سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۷۳-۷۴)

یہ ہے وہ 'معاشی نظام' جسے یہ حضرات یہاں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب انقلابِ روس نے سر اٹھایا تھا تو مغرب کی سرمایہ دار مملکتوں نے مسلمان قوموں کو مخاطب کر کے اپیل کی تھی کہ "دنیا کے خدا پرستو! آؤ! ہم مل کر منکرینِ خدا کا مقابلہ کریں۔" میاں صاحب نے اسی کانفرنس میں فرمایا:-

> ہمیں ایران کے مسلمانوں کی طرح قرآن پر اکٹھے ہو کر اسلامی نظام کی مخالف قوتوں کو زیر کرنا چاہیئے۔ (جنگ، لاہور۔ مورخہ ۲ را پریل ۱۹۸۲ء۔ صفحہ)

ایران کا نظام، کس قسم کا ہے۔ یا رکالعدم) جماعتِ اسلامی ـــــ اب تحریکِ اسلامی" اور ایران کے تعلقات کی بنیاد کیا ہے۔ قطع نظر ان امور کے، سر دست آپ اتنا ہی دیکھئے کہ میاں صاحب، مسلمانوں کے اکٹھا ہونے کی بنیاد، قرآن کریم ہی کو قرار دیتے ہیں..... الحمد للہ!

اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے (اس جماعت کے ترجمان) روزنامہ جسارت (کراچی) کی ۲۱ رمارچ ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی تھی:-

> لاہور: ۲۰ رمارچ (نمائندہ جسارت) تحریکِ اسلامی کے قائد میاں طفیل محمد نے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ ۲۱ سے ۲۳ رمارچ تک سہ روزہ "دعوت تعلیمِ قرآن" مہم میں بھرپور حصہ لیں اور اسے کامیاب بنا کر اس کے روحانی فیوض و برکات سے استفادہ کریں۔ واضح رہے کہ تحریکِ اسلامی کل سے پورے ملک میں سہ روزہ "دعوت تعلیمِ قرآن" مہم کا آغاز کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ملک بھر میں دروسِ قرآن کے ایک ہزار مراکز قائم کئے گئے ہیں جہاں سے ہزاروں لوگ قرآنی تعلیمات سے استفادہ کریں گے۔ بعد ازاں ان کو مستقل حیثیت دے دی جائے گی۔ اس سہ روزہ مہم کے موقع پر قرآنی آیات پر مبنی ہزاروں پوسٹر، اسٹکر اور پٹیاں ملک بھر میں چسپاں کی جائیں گی۔ سیرت کانفرنسوں اور تربیت گاہوں کا خصوصی اہتمام بھی کیا جا رہا ہے۔ مختلف مقامات پر بچوں کو قرآن کریم کی ناظرہ تعلیم، حفظِ قرآن اور اس کی قرأت و تجوید کے فضائل پر تقاریر اور سیمیناروں کا انعقاد بھی اس پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم کی فضیلت سے متعلق آیات اور احادیث پر مشتمل ایک کتابچہ بھی

تقسیم کیا جا رہا ہے۔ میاں طفیل محمد کل شام جامعہ منصورہ میں درسِ قرآن دے کر اس مہم کا آغاز کریں گے۔ اس کے اگلے دن مولانا عبدالمالک اور ۲۳ مارچ کو مولانا خلیل حامدی قرآن کے موضوع پر جامعہ منصورہ میں تقاریر کریں گے۔ اس سہ روزہ مہم کے بعد یکم اور ۲ اپریل کو لاہور ہی میں صوبائی سطح پر دو روزہ قرآن کانفرنس کا انعقاد بھی کیا جائے گا۔ دریں اثنا، ایک اطلاع کے مطابق مجلسِ خدمتِ اسلامی لاہور نے ۲۱ سے ۲۳ مارچ تک سہ روزہ دعوتِ تعلیمِ قرآن مہم کے سلسلے میں تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ مجلس کے سیکرٹری جنرل لیاقت بلوچ نے بتایا ہے کہ ان تین دنوں میں لاہور میں درسِ قرآن کے دو سو (۲۰۰) مراکز کا انتظام کیا گیا ہے، جن میں علمائے کرام اور پروفیسر حضرات درسِ قرآن دیں گے۔ اس کے علاوہ قرآنی تعلیمات پر مشتمل پوسٹر، اسٹکر اور بینر بھی تیار کئے گئے ہیں۔

اسی روزنامہ کی ۲۲ مارچ ۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

لاہور ۲۱ مارچ (نمائندہ جسارت) تحریکِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ملک بھر میں درسِ قرآن کے ایک ہزار مراکز نے آج سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ سہ روزہ دعوتِ قرآن مہم کا آغاز آج یہاں میاں طفیل محمد نے جامعہ منصورہ میں درسِ قرآن سے کیا۔ لاہور میں مجلسِ خدمتِ اسلامی نے دو سو مراکز درسِ قرآن کا اہتمام کیا ہے۔ مجلس کے زیرِ اہتمام آج جناح ہال میں ایک عظیم الشان دعوتِ قرآن کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میاں طفیل محمد نے کہا کہ پوری قوم فروعی اختلافات اور دوسرے جاہلانہ تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کی انقلابی تعلیمات پر متحد ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن ایک منصفانہ معاشی سیاسی اور سماجی انقلاب کا علمبردار ہے جس سے انسانیت اپنے گوناگوں مسائل سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن سیکھنے اور سکھانے کو بہترین عمل قرار دیا ہے۔ میاں صاحب نے تحریکِ اسلامی کے کارکنوں پر زور دیا کہ وہ ایک ایک فرد تک قرآن کی دعوت کو پہنچائیں اور اس پر صحیح معنوں میں عمل کا جذبہ بھی پیدا کریں۔ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ حقیقی خیر خواہی بھی یہی ہے کہ انہیں راہِ ہدایت کی طرف لایا جائے ورنہ جتنے بھی لوگ ہماری غفلت کی بناء پر غلط راستے پر چلتے رہیں گے ان کی خطا کاریوں کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہو گی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے اپنے خطاب میں کہا کہ قرآن کو تھام کر مسلمان قوم ایک بار پھر دنیا کی عظیم ترین قوم بن سکتی ہے انہوں نے علماء کرام سے اپیل کی کہ وہ فرقہ بندی اور فتوے بازی کی مہم ترک کر دیں۔ سید اسعد گیلانی نے کہا کہ قرآنِ پاک مسلمانوں کی قوت کا حقیقی سرچشمہ ہے اور اس کے دامن میں پناہ لے کر ہم مسلمان ٹوٹے ہوئے تار سے مرکائل بن سکتے ہیں۔ کانفرنس سے جناب فرید پراچہ اور لیاقت بلوچ نے بھی خطاب کیا۔ کانفرنس جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل قاضی حسین احمد نے آج پشاور میں مسجد حمایت خان میں سہ روزہ ملک گیر تعلیم القرآن پروگرام کا افتتاح کیا۔ انہوں نے اس موقع پر قوم پر قرآنی

تعلیمات پر مکمل عمل کرنے پر زور دیا۔

اتھارٹی کون ہے

اور آگے بڑھئے۔ یہ جو آجکل عورتوں کی پوزیشن کے متعلق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالے سے بحث چل رہی ہے، اس سلسلہ میں، صدر مملکت نے کہا تھا کہ "ڈاکٹر اسرار احمد اتھارٹی نہیں۔ اتھارٹی میں ہوں"۔ تو اس پر تنقید کرتے ہوئے، روزنامہ جسارت (کراچی) نے اپنی اشاعت بابت ۲۳ مارچ ۸۳ء کے اداریہ میں، اس عنوان کے تحت کہ "اتھارٹی صرف اللہ ہے" لکھا ہے:۔

> اتھارٹی صرف اللہ ہے۔ اس کا قرآن اور اس کے رسولؐ کی سنّت ہے، اور کوئی دستاویز یا شخصیت اتھارٹی نہیں ہو سکتی..... اب اگر صدر صاحب یہ کہیں کہ میں اتھارٹی ہوں تو یہ بڑی کج فکری اور غلط فہمی پر مبنی اظہارِ خیال ہے۔ ایسے اظہارِ خیال کے سلسلہ میں حکمرانوں کو اللہ سے استغفار کرنا چاہیئے۔

ہم اپنے مؤقر ہم عصر کو یاد دلا دیں کہ جہاں تک قرآن اور سنّت کا تعلق ہے، مودودی صاحب (مرحوم) نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ قرآن و سنّت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے، قرآن و سنّت کی جگہ ..... کہا تھا کہ فقہ حنفی کو ضابطہ، قوانین بنا لیا جائے۔

ظاہر ہے کہ جس "قرآن و سنّت" کے مطابق کوئی ضابطہ، قوانین مرتب نہیں ہو سکتا اس کے اتھارٹی ہونے کا مطلب کیا ہے؟ باقی رہی فقہ تو وہ تو بہرکیف شخصیتوں ہی کی مرتب کردہ ہے — اگر روزنامہ موصوف کے نزدیک "قرآن و سنّت" کے سوا کوئی دستاویز یا شخصیت اتھارٹی نہیں ہو سکتی، تو فقہ کس طرح اتھارٹی قرار پا سکتی ہے!

حسبنا کتاب اللہ

ڈاکٹر اسرار احمد کے بیان کے خلاف خواتین کی طرف سے احتجاج کے سلسلہ میں گورنر سندھ کی بیگم، محترمہ یاسمین عباسی صاحبہ نے:

> معاصر "جنگ" کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ہماری ہدایت کے لئے قرآن موجود ہے۔ اس لئے لوگوں کی ذاتی تاویلات کے لئے ذرائع ابلاغ کو اپنا قیمتی وقت نہیں دینا چاہیئے۔ (جسارت - ۲۰ مارچ ۱۹۸۳ء)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، روزنامہ "جسارت" نے لکھا ہے:۔

> بیگم صاحبہ اور ان کی ہمنوا بیگم اصغری رحیم کے نزدیک اسلام کی "عین روح" کیا ہے اور وہ

انہوں نے کہاں سے کشید کی ہے، ہمیں اس کا علم نہیں لیکن دونوں نے حوالہ اسلام اور قرآن کا دیا ہے۔ ہم ذاتی تاویلات تو کجا، پیغمبرِ قرآن حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اپنی تشریحات و احادیث، امہات المؤمنین کے طرزِ عمل، خلفائے راشدین کے دور میں، خواتین کی زندگی اور ان سے متعلق فقہا کی آراء، سب کو چھوڑ کر، صرف قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں جو بیگم یا سمیعہ عباسی صاحبہ کے لئے بھی تسلیم شدہ کتابِ ہدایت ہے۔

(جسارت۔ مورخہ ۲۰ مارچ ۸۲ء)

عورتوں کے حقوق و فرائض سے متعلق بحث سے قطعِ نظر، کیا معاصر جسارت، اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے کہ کسی معاملہ کے اسلامی یا غیر اسلامی قرار پانے کے لئے، قرآنِ مجید سند اور حجت ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غیر اسلامی ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اُمت کے تمام جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

معذرت ہی نہیں، ندامت بھی!

ادارہ طلوعِ اسلام نے قریب چالیس سال سے پرویز صاحب کی قرآنی فکر سے متعلق لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس میں ان کی دو دو ہزار صفحات پر مشتمل تصانیف بھی شامل ہیں۔ ادارہ انتہائی کوشش کرتا ہے کہ ان کتابوں کا معنوی حیثیت سے جس قدر بلند معیار ہے صوری حیثیت سے بھی ان کا معیار ویسا ہی بلند ہو۔ چنانچہ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتابوں نے طباعتی لحاظ سے بھی ملک میں اپنا مقام قائم کر رکھا ہے۔ اس باب میں، کاغذ، کتابت۔ طباعت۔ تجلید کے علاوہ صحت پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ ہمارا معمول یہ ہے کہ مصنف کے مسودہ کو صاف کرا کر کاتب کو دیا جاتا ہے۔ کتابت شدہ کاپیوں کو چیک کرنے کے لئے قابل اور تجربہ کار "پروف ریڈرز" تعینات کئے جاتے ہیں۔ ان مدات پر اخراجات کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کے بعد یہ کاپیاں پریس میں جاتی ہیں

اس سے پہلے پرنٹنگ کے طریق میں، پریس پروف دیتا تھا جنہیں دوبارہ چیک کیا جاتا تھا۔ اس لئے غلطیوں کا امکان بہت کم رہتا تھا لیکن موجودہ طریقِ طباعت میں پریس پروف نہیں مہیا کرتا۔ جو کاپیاں بھیجی جاتی ہیں انہیں ویسے ہی چھاپ دیتا ہے۔ اس سے .... ظاہر ہے کہ کتاب کی صحت کا سارا دارومدار "پروف ریڈرز" پر ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے، کاپیوں کو چیک کریں تو غلطیاں کم ہوں گی۔ اگر وہ تساہل اور عدمِ احتیاط سے کام لیں تو غلطیاں زیادہ رہ جائیں گی۔

پہلے غلطیاں کم رہا کرتی تھیں، لیکن مطالب الفرقان جلد چہارم میں غلطیاں اس قدر کثیر اور فاش ہیں کہ انہیں دیکھ کر ندامت سے ہماری گردن جھک جاتی ہے۔ ایسی گرانقدر کتاب میں اس قسم کی اور اس کثرت سے اغلاط، قارئین کے لئے جس قدر کوفت کا موجب ہوتی ہیں، وہ تو ایک طرف خود مصنف کے دل پر اس سے جو گذرتی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن اس باب میں معذرت اور ندامت سے زیادہ ہمارے بس میں کچھ نہیں۔ اکثر غلطیوں کی نشاندہی قارئین نے بھی کرائی ہے اور ہم خود بھی کتاب کو چیک کر رہے ہیں۔ اس کے اغلاط نامہ مرتب کیا جائیگا جسے طلوعِ اسلام میں بھی شائع کر دیا جائیگا اور کتاب کی جو جلدیں ہنوز سٹاک میں ہیں، ان کے ساتھ شامل بھی کر دیا جائے گا۔

ہمیں امید ہے کہ قارئینِ کرام ہماری اس معذرت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے۔ (ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور ـــــ اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :-	نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپس بزموں کے لئے ریکارڈ کرلئے جاتے ہیں
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, . TEL: 553-1896	
برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر - (بمقام)		60, HERICK RR SALTLEY, B8 INT.	
اوسلو (ناروے) ہر ماہ کا پہلا سنیچر شام ۶ بجے (بمقام)		MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-I	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۲	ہر جمعہ ۱/۲ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام کمرہ نمبر ۲۳ ہارون چیمبرز - الطاف حسین روڈ نیو چالی - فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور	(۱) ہر جمعہ ۵ بجے شام (۲) ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر (OPP: TVIP. MARGATE) پشاور سٹیڈیم بارہ روڈ فون ۷۲۶۵۹ ہوٹل نعمت کدہ - یونیورسٹی روڈ - جہانگیر آباد -	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف - محمود علی صاحب - آکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیہ	ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس - شہید روڈ (لیہ)	
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب - واقع 234-K-L کیہال (ایبٹ آباد)	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۸ - نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ - غنی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب -	
چکوال	ہر جمعہ ۱/۲ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد چوہدری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام -	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ - باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت - گل روڈ - سول لائنز	
گجرات - ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر بمقام - ۱۲/۱/بی - طعمیر روڈ ... باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ			
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ	دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنٹر بیرون پاک گیٹ (فون ... ۳۱۰۷۱)	
پنجکسی (تحصیل کبیروالا، ملتان)	ہر جمعہ ۲ بجے سہ پہر	بمقام - مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
ہنگو	ہر جمعہ ۱/۲ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۲۷)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام - حیات سرجیکل کلینک ۲۳/۷ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون ۴۲۰۵۵)	

باسمہٖ تعالیٰ

کسی حیوان نے بھی اپنی ہم جنس کے ساتھ وہ کچھ
نہیں کیا جو مرد نے عورت کے ساتھ کیا ہے!

۷

عورت — قرآن کے آئینے میں

عورت — قرآن کے آئینے میں

ہم نے اس موضوع پر اکثر و بیشتر لکھا ہے - اور بکثرت لکھا ہے - علاوہ ان مقالات کے جو وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہتے ہیں، پرویز صاحب کی مستقل تصنیف ـــــ طاہرہ کے نام خطوط ـــــ اس موضوع پر بڑی معلومات افزا ہے - نیز مطالب الفرقان کی مختلف جلدوں میں متعلقہ آیات کی تشریحات مزید تفصیلات در آغوش ہیں - اس لئے ہمیں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن حال ہی میں اس موضوع نے ملک میں جو اہمیت حاصل کی تو اس سے متاثر ہوکر، بیشتر قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے کہ طلوعِ اسلام میں اس موضوع پر ایک جامع مقالہ کی ضرورت ہے جس میں اس کے مختلف گوشوں کو سامنے لایا جائے - زیرِ امتثالِ امر مقالہ پیشِ خدمت ہے جو ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر پرویز صاحب کی تصانیف اور طلوعِ اسلام میں شائع شدہ مقالات پر مبنی ہے - چونکہ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر پیش کیا جاتا ہے وہ بیشتر، یہودیت اور عیسائیت میں رائج "افسانوں" پر مشتمل ہے اس لئے بغرضِ تقابل بعض مقامات پر ان کے لٹریچر کے اقتباسات یا حوالے ناگزیر ہو جاتے ہیں - ان سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ جو کچھ ہمارے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے، اور اس کے بعد جب قرآنی حقائق کو سامنے لایا جائے گا، اس سے واضح ہو جائے گا کہ دین کی رُو سے حقیقت کیا ہے - واضح رہے کہ ہمارے پیشِ نظر نہ کسی سے بحث و مباحثہ ہے - نہ کسی پر تنقید و تنقیص مقصود - ہمارا مقصد صرف قرآنی حقائق پیش کرنا ہے - اس سے اگر کسی مروّجہ عقیدہ یا کسی کے کسی دعویٰ پر زد پڑتی ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی، کیونکہ اس بات میں مدعی، قرآن ہے - ہم نہیں - ہمارا فریضہ قرآن کے دعاوی کو پیش کرنا ہے اور بس -

——— (٠) ———

عیسائیت میں عورت کا مقام

بائیبل میں کہا گیا ہے کہ آدم اور اس کی بیوی جنت میں تھے - شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آکر بہک اور بھٹک گیا - اس بنا پر عیسائیت گناہِ اوّل کا مجرم عورت کو قرار دیتی ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے - اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت، دنیا میں تمام مصائب کا سرچشمہ ہے' اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق - عیسائیت کا مقدس لٹریچر عورت کے

خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد کی زندگی کو وجہ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں"۔ اس کے بعد اس نے کہا۔

> آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گرجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رُو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ پر رہنا چاہیئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے
> (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے"۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جا سکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آئی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جائے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی، مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و تانیث کا امتیاز ہی اٹھ جائے گا۔[1]

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بدقسمتی کہ خود ہم (مسلمان) بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام کا جزو بنا کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ قرآن کریم نے واضح طور پر بتا دیا تھا کہ شیطان نے آدم کی بیوی (عورت) کو نہیں بہکایا تھا بلکہ آدم اور اس کی بیوی (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا تھا۔ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ ..... (۲/۳۶) "شیطان نے مرد اور عورت، دونوں کو (هُمَا) بہکایا"۔ (قصۂ آدم کی قرآنی تصریحات پرویز صاحب کی کتاب "ابلیس و آدم" یا "مطالب الفرقان" جلد دوم میں ملیں گی)۔

(-)

---

[1] اِن امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب :-

"WOMAN IN ANTIQUITY BY CHARLES SELTMAN"

عورت کی پیدائش

عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور، خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابنِ کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوّا کو پیدا کیا جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے اُن سے انس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنّت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔
> بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرتِ حوّا پیدا کی گئیں۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ، ابنِ مسعودؓ وغیرہ صحابہؓ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنّت سے نکالنے کے بعد حضرتِ آدم علیہ السلام کو جنّت میں جگہ دی گئی لیکن تنِ تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرتِ حوّا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرتِ حوّا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ ؂۱

دوسری جگہ ہے کہ

> صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ ؂۲

اس تفسیر اور روایات کی رُو سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں)، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہو گی۔

اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اس "ٹیڑھی پسلی" کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور

؂۱ ترجمہ اُردو مولانا محمد جونا گڑھی۔ پارہ اوّل۔ صفحہ ۸۵۔

؂۲ " " " " " " ۔ پارہ چہارم۔ صفحہ ۶۶۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پاگئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورۃ النساء میں ایک آیت ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ..... (۴/۳۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "مرد عورتوں پر حاکم یا داروغہ ہیں"۔[1] اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر (سورۃ النساء پارہ پنجم) میں ہے کہ

> حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اتری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضرِ خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپؐ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اللہ نے اور چاہا۔ (ح۲)۔ اردنا امراً و اراد اللہ غیرہ۔
>
> (تفسیر المنار۔ مفتی محمد عبدہٗ۔ جلد ۵۔ ص۳۴)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے) حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی نہ چاہے تو میں کیا کر دوں[2] (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ

> ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ لونڈیوں[3] کو مارو نہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمرؓ فاروق آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپؐ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوئی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زدوکوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔
>
> حضرت اشعث رضہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کا مہمان ہوا اتفاقاً

---

[1] اس کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

[2] ان حضرات کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضورؐ کا ہر قول، وحیِ خداوندی پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ ذرا سوچیں کہ اس عقیدہ کی رُو سے اس ارشادِ نبوی صؐ کا کیا مفہوم ہو گا کہ ہم نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے اس کے خلاف حکم دے دیا۔

[3] بات بیویوں کی ہو رہی ہے۔ کیا انہی کو "لونڈیاں" کہہ کر پکارا گیا ہے۔

اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاکی ہو گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ اشعثؓ! تین باتیں یاد رکھ جو میں نے آنحضرتؐ سے سُن کر یاد رکھی ہیں: ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (صفحہ ۲۱-۲۰)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پہ بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور روٹھنے کے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں۔ (صلا۲)

یہ تو (ہمارے ہاں کے مروجہ مذہب کی رُو سے) عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتبِ روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ

حضرت ابوہریرہؓ مروی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حوّا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری - کتاب پیدائشِ انبیاءؑ)

دوسری روایت ہے:-

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں۔ (بخاری کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا۔ (بخاری - کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔ ؎ (بخاری کتاب الانبیاء)

صاف نظر آ رہا ہے کہ اس مقصد کے پیشِ نظر، کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کر سکیں کہ بائیبل میں یا عیسائیت کے

؎ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ اور دوسری طرف بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے جہنّم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں "مائیں" نہیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں —— اگر سب کی سب، نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی —— تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے تو جنت تھی لیکن وہ خود جہنّم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں "بیوی" ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور حیثیت نہیں ہوتی۔

یہ روایات وضعی ہیں

عقائد کی رُو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں نے خاص سازش کے تحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا ہی کیا تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قرار دے کر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی، حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کس طرح صحیح قرار پا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو "سوختہ بخت" یہ کہہ دے کہ ایسی روایات کی نسبت، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اُسے "منکرِ حدیث" قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں!

(٥)

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴)

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عورتوں کو مارنے پیٹنے کی تائید میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس آیت کا قرآنی مفہوم سامنے لایا جائے۔ یہ پوری آیت اور اس کا مروجہ ترجمہ یوں ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا۔ (۴/۳۴)

اس آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے بہ سبب اس کے کہ بزرگی دی اللہ نے بعضے ان کے کو اوپر بعض کے۔ اور بہ سبب اس کے کہ خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے سے، پس نیک بخت عورتیں فرماں بردار ہیں۔ نگہبانی کرنے والی ہیں بیچ غائب کے ساتھ محافظت اللہ کے۔ اور جو عورتیں کہ تم ڈرتے ہو چڑھائی ان کی سے۔ پس نصیحت کرو ان کو، اور چھوڑ دو ان کو بیچ خوابگاہ کے اور مارو ان کو۔ پس اگر کہا مانیں تمہارا پس مت ڈھونڈو اوپر ان کے راہ تحقیق اللہ ہے بلند بڑا۔

(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

اب اس آیت کے قرآنی مفہوم کی طرف آئیے:۔

آیت کا صحیح مفہوم

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس آیت میں میاں اور بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی۔ اَلرِّجَالُ (ر

مردوں) اور اَلنِّسَآءُ (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے، اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے طبیعی فرائض کی سرانجام دہی کی وجہ سے اکثر اوقات اکتسابِ رزق سے معذور ہو جاتی ہیں۔ ان کے برعکس مردوں کا سارا وقت اس کے لئے فارغ ہوتا ہے۔ لہٰذا، قرآن نے تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ بتایا کہ وہ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ ہیں۔ لغت میں قَامَ الرَّجُلُ عَلَی الْمَرْاَۃِ کے معنے دیئے ہیں۔ مَانَہَا۔ یعنی اس نے روزی مہیا کی۔ قوام عَلَیْھَا کے معنی ہیں مائن لھا۔ یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔ اس سے آیت کا مفہوم واضح ہوگیا۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ یعنی معاشرہ میں مردوں کے ذمے یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے لئے اکتسابِ رزق کریں۔ اس لئے کہ (بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ) تقسیمِ کار کے اصول کی بنا پر ایک قسم کی استعداد مردوں کو زیادہ دی گئی ہے اور دوسری قسم کی استعداد عورتوں کو۔ اور چونکہ مردوں کا سارا وقت اکتسابِ رزق کے لئے فارغ ہوتا ہے اور عورتیں اس سے اکثر اوقات معذور ہو جاتی ہیں، اس لئے مردوں کا کمایا ہوا رزق، عورتوں کی ضروریات کی کفالت کرتا ہے۔ (بِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ۔) اس سے عورتوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں گی اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پائیں گی — (فَالصّٰلِحٰتُ) اور انہیں فراغت نصیب ہو جائے گی کہ وہ اپنی خاص صلاحیتوں کو اسی مصرف میں لائیں جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں۔ یہ معنی ہیں قٰنِتٰتٌ کے۔ سقاء قنیت اس مشکیزے کو کہتے ہیں جس میں پانی بھرنے کے بعد، اسے اس طرح اچھی طرح سی کر بند کر دیا جائے کہ وہ اپنا پانی محفوظ رکھے۔ راستے میں کہیں نہ گرائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں اس کا منہ کھل سکے۔ اگر عورتوں کو اکتسابِ رزق کرنا پڑے تو جس مقصد کے لئے انہیں خاص صلاحیتیں دی گئی تھیں وہ مقصد پورا نہیں ہوگا۔ اس کے بعد دو لفظوں میں اس نکتہ کو اور بھی واضح کر دیا جب فرمایا کہ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔ یعنی جب اللہ کے قانون نے اس طرح ان کی حفاظت (پرورش) کا سامان بہم پہنچا دیا تو انہیں اطمینان اور فرصت مل گئی کہ وہ اس چیز کی حفاظت کر سکیں جو پوشیدہ طور پر ان کے سپرد کی گئی ہے۔ (یعنی جنین کی حفاظت)۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن، عورتوں کے خصوصی فرائض اور ان سے متعلقات امور کا تذکرہ نہایت سنجیدہ استعاروں میں کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مروّجہ تراجم اور تفاسیر کی رُو سے بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں کیونکہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ (ان کے برعکس) نیک بیویاں (فَالصّٰلِحٰتُ) کا شیوہ یہ ہے کہ وہ فرمانبردار (قٰنِتٰتٌ) ہوتی ہیں اور مرد کی غیر حاضری میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ یعنی مردوں کا کام یہ ہے کہ عورتوں پر حکومت کریں۔ اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ مردوں کی فرمانبرداری اور عصمت کی حفاظت کریں۔ گویا صٰلِحٰتٌ اور قٰنِتٰتٌ اور حٰفِظٰتٌ ہونا صرف عورتوں کے لئے ہے۔ حالانکہ قرآن نے سورۂ احزاب (۳۳/۳۵) میں یہ

سب خصوصیات مردوں اور عورتوں دونوں میں مشترکہ طور پر بیان کی ہیں۔ اس لئے اگر احکام الٰہیہ کا "فرماں بردار" ہونا عورت کے لئے ضروری ہے تو قرآن کی رُو سے مرد کے لئے بھی ضروری ہے۔ لہٰذا، یہ مفہوم کہ مرد کمانے اور حکومت کرنے کے لئے ہیں، اور عورتیں، مردوں کی فرمانبرداری کرنے کے لئے، اس اعتبار سے بھی غلط ہے۔ مرد اور عورت کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے اور رفاقت میں ایک کی حکومت اور دوسرے کی فرمانبرداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق (زوج) ہوتے ہیں اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں۔ خود لفظ (زوج) میں مکمل موافقت اور کامل رفاقت کا مفہوم پنہاں ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ آیت کا باقی ماندہ حصّہ یہ ہے۔ (وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ) چونکہ ہماری تفسیروں میں یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ مرد کا کام عورت پر حکومت کرنا اور عورت کا کام مرد کی فرمانبرداری ہے، اس لئے باقیماندہ آیت کا مفہوم، اسی کی تائید میں، یہ لیا گیا کہ اگر بیوی، مرد کی فرمانبرداری نہ کرے تو

عورتوں کو مارنا

وہ پہلے اسے سمجھائے بجھائے، پھر اس سے باہمی تعلقات منقطع کر لے۔ اور اس پر بھی کام نہ چلے تو اُسے مارے پیٹے۔

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہاں گفتگو میاں بیوی کے متعلق نہیں ہو رہی، عام مردوں اور عورتوں کے فرائض کے متعلق ہو رہی ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مردوں کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اکتسابِ رزق کریں اور عورتیں، رزق کی طرف سے یوں مطمئن ہو جانے کے بعد اپنے خصوصی وظائفِ حیات کو بطریقِ احسن سرانجام دیں۔ اس کے بعد کہا گیا کہ اگر عورتیں ان انتظامات کے باوجود (جن کی رُو سے وہ اکتسابِ رزق کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہیں) معاشرہ کے اس نظم اور تقسیمِ کار کے اصول سے بلا عذر سرکشی اختیار کریں (جیسا کہ آجکل یورپ کے بعض ممالک میں ہو رہا ہے) تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کی فوضویت (ANARCHY) کو روکے۔ اس لئے کہ اگر عورتوں نے مرد بننے کے چاؤ میں، بلا عذر، اپنے فرائض کو چھوڑ دیا تو نسلِ انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہو جائے گا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ معاشرہ ایسا انتظام کرے کہ پہلے تو اس قسم کی ذہنیت رکھنے والی عورتوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ ان کی یہ روش معاشرہ کے لئے کس قدر تباہی کا موجب ہے۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو پھر انہیں ان کی خواب گاہوں میں چھوڑ دیا جائے۔ یہ ایک قسم کی نظر بندی..... (INTERNMENT) کی سزا ہوگی۔ اور اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رکیں تو پھر انہیں عدالت کی طرف سے بدنی سزا (CORPORAL PUNISHMENT) بھی دی جا سکتی ہے۔

واضح رہے کہ عورت کو نسل کشی کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مقصد اس ارشادِ خداوندی کا یہ ہے کہ نسل کشی کے خلاف سرکشی کی تحریک نہ پیدا ہونے دی جائے۔

یہاں ضمناً یہ وضاحت ضروری ہے کہ قرآن کریم نے اسلامی نظام کے لئے مملکت کا وجود لابنفک قرار دیا ہے۔ لیکن اس نے مملکت۔ حکومت۔ نظامِ عدل اور اس کی جزئیات۔ عدالت وغیرہ اصطلاحات استعمال نہیں کیں۔

چونکہ وہ نظامِ مملکت کی ذمہ داری تمام اُمت کے سر پر ڈالتا ہے اس لئے وہ ان تمام امور کی سرانجام دہی کے لئے (جو آج کل حکومت کے مختلف شعبوں کی طرف سے سرانجام دیئے جاتے ہیں) صرف کم (تم) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یا (حکم) کا لفظ۔ مثلاً وہ سرقہ کی سزا کے لئے کہتا ہے کہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ..... (۵/۳۸) "تم سارق مرد اور سارقہ عورت کے ہاتھ کاٹ ڈالو"۔ ظاہر ہے کہ سرقہ کے ملزموں کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا۔ جرم ثابت ہونے پر سزا کا فیصلہ بھی عدالت کی طرف سے ہوگا، اور اس سزا پر عمل درآمد حکومت کی انتظامیہ کی طرف سے، لیکن قرآنِ کریم نے نہ عدالت کا ذکر کیا ہے، نہ انتظامیہ کا۔ صرف "تم" کہا ہے۔ "تم" سے مراد یہ نہیں کہ معاشرہ میں ہر ایک (یا مستغیث) کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ خود ہی چور کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ اس سے واضح ہے کہ آیۂ زیرِ نظر (۴/۳۴) میں مردوں (خاوندوں) کو اس کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ بیویوں کو پٹینا شروع کر دیں۔ ایسا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہوگا۔

یہ ہے صحیح مفہوم اس آیت کا جس کی رُو سے ہمیں بتایا جاتا ہے کہ خاوند اپنی بیویوں پر حاکم اور داروغے ہیں اور انہیں حق حاصل ہے کہ وہ بیویوں کو اپنا محکوم اور مغلوب رکھیں۔ قرآن تو کسی انسان کو بھی اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔

(۰)

مرد اور عورت ہمدوش

قرآنِ کریم نے انسان ہونے کی جہت سے کس طرح مردوں اور عورتوں کو یکساں مقام پر رکھا ہے، اس کے متعلق اصولی طور پر گفتگو مقالہ کے اخیر میں کی جائے گی۔ اس مقام پر چند ایک آیات درج کی جاتی ہیں، جن سے واضح ہوگا کہ قرآنِ کریم کس طرح مصافِ زندگی کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں، مردوں اور عورتوں کو ہم دوش اور ہم قدم قرار دیتا ہے۔ مثلاً اس نے سورۂ احزاب میں کہا ہے:۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (۳۳/۳۵)

"اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں۔ (اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت

ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ)۔ اگر مرد اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں، (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں اُن کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں، تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ)۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ)۔ جب یہ صلاحیتیں، دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا)۔

قرآن کی ان تفاصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴)۔ ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں ہوگا۔ (لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۴)

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات، جو اس کے ان فرائضِ زندگی کی ادائیگی کے لئے معاون بن سکیں۔ مثلاً بچے کے لئے محبت اور پیار کا جذبہ اور ایثار و قربانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ جنین، ماں کے خون سے مترتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہار اور برداشت کا مادہ اس قدر فراواں ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضے کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی

سے پورا کیے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صلہ یا معاوضہ کی تمنّی نہیں ہوتی۔ یہ، اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے اُمتِ مسلمہ (مملکتِ اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایۂ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت و حکمت کی رُو سے ہوگا۔

آپ سوچیے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے۔

واضح رہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" وعظ و نصیحت کا نام نہیں۔ یہ حکومت کا فریضہ۔ سورۃ الحج میں ہے کہ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت حاصل ہوگی تو یہ اقامت الصلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔ اور تمام امور کا آخری فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔

اب ظاہر ہے کہ جب آیت (۹/۷۱) میں، مردوں اور عورتوں، دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیں گے، تو ظاہر ہے کہ عورتیں بھی امورِ مملکت میں برابر کی شریک ہو سکتی ہیں۔

—(۰)—

حقوق و فرائض

جہاں تک مردوں (خاوندوں) اور عورتوں (بیویوں) کے حقوق و فرائض کا تعلق ہے قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو چار الفاظ میں اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرتی ہے۔ فرمایا:-

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ... (۲/۲۲۸)

جس قدر عورتوں کی ذمہ داریاں ہیں اسی قدر ان کے حقوق ہیں۔

یعنی جو ذمہ داری بھی ان پر عائد کی جائے، اس کے مقابل میں ان کا ایک حق ثبت ہو جاتا ہے —— ہر ذمہ داری کے بالمقابل ایک حق —— فرمایئے! اس سے بڑھ کر مساوات کیا ہو سکتی ہے؟

لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ وہی آیت جس کی رُو سے قرآن کریم نے عورت اور مرد کے حقوق اور فرائض کو یکساں قرار دیا ہے، یہ حضرات اُسے اپنے اس دعوے کے ثبوت کے لئے بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ مردوں کے مدارج عورتوں کے مقابلہ میں بلند ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی دلچسپ بھی ہے اور عبرت آمیز بھی۔ وہ کہتے ہیں کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ کے بعد ہے: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ... (۲/۲۲۸) جس کے (ان کے نزدیک) معنی ہیں۔ "مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے"۔ یا یہ کہ مردوں کے درجات عورتوں کی بہ نسبت بلند ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق اور فرائض ایک جیسے ہیں۔ لیکن مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے تو یہ کھلا ہوا تضاد ہوگا۔ اگر ان کے حقوق و فرائض مساوی ہیں تو پھر ایک جنس کو دوسری پر فضیلت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ اور ایک کے درجات بلند کیسے ہو سکتے ہیں؟ قرآنِ کریم نے درجۃ کہا ہے جس کے معنی ایک درجہ کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایک درجہ کیا ہے جو عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کو حاصل ہے۔ اس کا جواب پوری آیت سامنے لانے سے مل جاتا ہے۔ آیت یوں ہے:۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۖ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۲/۲۲۸)

طلاق یافتہ عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو (نکاحِ ثانی کے لئے) تین حیض کے عرصہ تک روکے رکھیں (جسے عدّت کی مدت کہتے ہیں)۔ ... (اس کے بعد عدّت کی تفصیلات دی گئی ہیں اور پھر کہا گیا ہے کہ) یہ ایک بات ہے جس میں عورت کے مقابلہ میں مرد کی پوزیشن ایک گونہ (ADVANTAGEOUS) ہے۔ یعنی عورت کے لئے عدّت ہے۔ مرد کے لئے عدّت نہیں۔ ورنہ، قانونِ خداوندی کی رُو سے مرد اور عورت کے حقوق اور فرائض یکساں ہیں۔

یہ ہے وہ آیت جس کی رُو سے دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

(۰)

مردوں اور عورتوں کی مساوات کے خلاف دو اعتراضات اور بھی کئے جاتے ہیں۔ یعنی:۔

(i) وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے سے آدھا ہے ؛ اور

(ii) شہادت کے لئے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے ۔

وراثت میں لڑکی کا حصہ

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے ۔ قرآن کریم میں ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے ۔ (ملاحظہ ہو ۴/۱۱) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ، قرآن کریم کی رُو سے ایک ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں اکتسابِ رزق کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے ذمے ہوتی ہے کیونکہ ان فرائض و واجبات کی ادائیگی سے جو بنیادی طور پر عورت کے ذمے ہوتے ہیں ، عورت کو بالعموم اتنی فرصت نہیں مل سکتی کہ وہ اکتسابِ رزق کا بوجھ اٹھا سکے ۔ اب ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں اکتسابِ معاش کی ذمہ داری بنیادی طور پر مرد کے سر پر ہو اس میں معاشی اسباب کی تقسیم میں مرد کا حصہ یقیناً زیادہ ہونا چاہیئے ۔ یہ وجہ ہے کہ ترکہ میں لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر رکھا گیا ہے ۔ لڑکیوں کے ذمہ نہ اپنے اخراجات کی کفالت ہوتی ہے نہ اپنے خاندان کے رزق کی کفالت ۔ اس کے برعکس ، لڑکے نے اپنے لئے بھی اکتسابِ رزق کرنا ہوتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے بھی ۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے ۔ جہاں ایسی صورت نہیں وہاں عورت کا حصہ مرد کے برابر رکھا گیا ہے ۔ مثلاً ماں باپ میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶) یا کلالہ کی صورت میں بہن اور بھائی میں سے ہر ایک کا حصہ (۱/۶) ۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ قرآن مجید نے کلیہ کے طور پر عورت کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے ۔

لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مرد اپنے اس فریضہ کو نظر انداز کر رہے ہوں اور لڑکیوں کے متعلق اندیشہ ہو کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں رہ جائیں گی تو قرآن نے متوفی کو پورا پورا حق دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی تقسیم اقتضائے حالات کے مطابق جس طرح جی چاہے (از روئے وصیّت) کر جائے ۔ قرآن کے مقرر کئے ہوئے حصے اُس صورت میں عمل میں آتے ہیں جب متوفی بلا وصیّت کئے مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہوتی ہو ۔ قرآن میں اس کی صراحت موجود ہے ۔ (آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ مروجہ قانونِ شریعت کی رُو سے ، وصیّت کا قرآنی قانون منسوخ سمجھا جاتا ہے ! یا للعجب) ۔

(o)

عورتوں کی گواہی

دوسرا اعتراض ہے شہادت کے متعلق ۔ سورۃ بقرہ میں آیت ۲۸۲ میں ہے کہ جب تم آپس میں قرضہ کا معاملہ کرو تو اسے ضبطِ تحریر میں لے آؤ اور اس پر دو مرد بطورِ گواہ بلا لیا کرو ۔ اس سے آگے ہے :.....
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ ۔ کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کو بطورِ گواہ بلا لیا کرو ۔ دو عورتیں کیوں بلائی جائیں ، اس کی علت قرآن نے یہ کہہ کر خود ہی

بیان کردی ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى .....

عام طور پر اس آیت کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ دو عورتوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ "ان میں سے اگر ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے"۔

ضلال کے بنیادی معنی ہیں، بات کا مبہم یا غیر واضح سا ہو جانا۔ ذہن میں اُلجھاؤ سا پیدا ہو جانا۔ واضح تر الفاظ میں (TO GET CONFUSED OR BECOME PERPLEXED)۔ اس لفظ کی وضاحت کے بعد اب اصل آیت کی طرف آیئے۔ اس آیت سے یہ سوال اٹھائے جاتے ہیں کہ

(i) ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کو کیوں ضروری قرار دیا گیا۔ اور

(ii) یہ بات خصوصیت سے عورتوں کے متعلق کیوں کہی گئی کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اُلجھاؤ سا پیدا ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے؟ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک عورتیں مردوں کے مقابلہ میں کم قابلِ اعتماد ہیں اور ان میں ذہنی صلاحیت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک قابلِ اعتماد ہونے کا تعلق ہے، قرآن نے شہادت میں مردوں کے لئے بھی دو کی شرط عائد کی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائیگا کہ قرآن مردوں کو بھی قابلِ اعتماد نہیں سمجھتا۔ اسی لئے ایک کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ایک کے ساتھ دوسرے کی شہادت بھی ضروری قرار دی گئی ہے؟ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصود یہ نہیں کہ ایک مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک کے بیان میں سہو یا سقم رہ جائے تو دوسرے کے بیان سے اس کی کمی پوری ہو جائے۔ یعنی اس سے ایک امکانی احتمال کی قانونی سطح تھام مقصود ہے۔ مردوں کے متعلق یہ فتویٰ دینا مقصود نہیں کہ مرد قابلِ اعتماد نہیں ہوتے اس لئے ان میں سے کسی ایک (تنہا) کی شہادت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یعنی مقصود شہادت کی توثیق (پختہ کرنا) ہے، نہ کہ مردوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کا اعلان۔

اسی طرح، جب قرآن نے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو ضروری قرار دیا ہے تو اس سے بھی یہ مقصود نہیں کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتیں کم قابلِ اعتماد ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مرد کی جگہ دو عورتیں ضروری ہیں۔ یہاں بھی مقصود ایسا طریقہ اختیار کرنا ہے جس سے شہادت زیادہ سے زیادہ یقینی ہو جائے۔ ورنہ جہاں تک مردوں اور عورتوں کے تقابلی (COMPARATIVE) اعتماد کا تعلق ہے، قرآن نے دونوں کو ایک ہی حیثیت دی ہے۔ مثلاً قرآن میں جہاں لعان کی شہادت کا ذکر ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کو بھی ایسا ہی قابلِ قبول قرار دیا ہے جیسا کہ ایک مرد کی شہادت کو۔ (ملاحظہ ہو $\frac{۲۴}{۶-۹}$)۔

اب سوال دوسرا باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن نے بالخصوص عورتوں کے متعلق کیوں کہا ہے کہ اگر ان میں سے ایک کو کچھ اشتباہ لاحق ہو جائے، کچھ گھبراہٹ سی ہو جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

وہ تو زمانہ نزولِ قرآن کی بات ہے۔ آپ آج بیسویں صدی میں ہمارے ہاں کی مستورات میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جا کر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیجئے جہاں گرد و پیش اجنبی مرد ہوں۔

وہاں دیکھئے کہ اس بیچاری کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس کے پسینے چھوٹ جائیں گے۔ وہ کانپنے لگ جائے گی۔ اس کی گھگھی بندھ جائے۔ اگر اس کے ساتھ اس کی کوئی جان پہچان والی عورت موجود ہو تو اس کا حوصلہ بندھ جائے گا۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت ہو جائے گی۔ اس دوسری عورت کا ساتھ ہونا اس کے لئے باعثِ تقویت ہوگا۔ قرآن کریم نے ان عورتوں کے متعلق کہا ہے کہ

اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۴۳/۱۸)

یہ، زیورات میں پلی ہوئی جھگڑے کے وقت اپنے مافی ضمیر کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔

اس قسم کی ہیں وہ عورتیں جن کے متعلق کہا ہے کہ انہیں عدالت میں جانا پڑے تو ان کے ساتھ (ان کی جان پہچان والی) ایک عورت کھڑی کر دو تاکہ اس کا حوصلہ بندھ جائے۔

ان تصریحات کے علاوہ یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ایک عورت کی شہادت کے بعد دوسری عورت کی شہادت لی جائے، اور اس طرح دو شہادتیں ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ اس نے کہا یہ ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کہیں (CONFUSED) ہو جائے تو اس کے ساتھ کھڑی سہیلی اسے یاد دلا دے کہ صحیح بات کیا تھی۔ (وہ عدالت سے کچھ نہیں کہے گی۔ گواہی دینے والی اپنی بہن کو صحیح بات یاد دلا دے گی) اس سے ظاہر ہے کہ اگر گواہی دینے والی عورت کو کوئی گھبراہٹ نہ ہو۔ وہ کہیں غلطی نہ کرے، تو ساتھ والی عورت کو مداخلت کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ لڑکیوں کی پرورش "زیورات" میں نہ کی جائے جس سے وہ معاملاتِ زندگی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ ہو سکیں اور یوں غیر مبین (گونگی) بن کر رہ جائیں۔ بلکہ انہیں زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا جائے۔ اس صورت میں وہ غیر مبین نہیں رہیں گی اور دوسری عورت کی مداخلت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ ہے حقیقت ان اعتراضات کی جن کی رُو سے عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں ناقص العقل، ناقابلِ اعتماد اور مردوں سے پست درجہ پر قرار دیا جاتا ہے۔

(۵)

عورتوں کے حقوقِ ملکیت

پہلے کہا جا چکا ہے کہ تقسیمِ کار کی رُو سے، بیوی بچوں کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عورت نہ کما سکتی ہے، اور نہ ہی اسے حقوقِ ملکیت حاصل ہوتے ہیں۔ وہ کما بھی سکتی ہے اور اسے ذاتی حقوقِ ملکیت بھی حاصل ہوتے ہیں۔ سورۃ النساء میں ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ (۴/۳۲)

ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں، اس غلط تصوّر کا ازالہ بھی ضروری ہے

جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ حقوقِ ملکیت مرد کو حاصل ہوتے ہیں، عورت کو نہیں ہوتے۔ عورت اپنے مال اور جائداد کی آپ مالک ہوتی ہے (۴/۳۲)۔ اسی طرح یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ کمائی کرنا مردوں کا کام ہے، عورتیں ایسا نہیں کر سکتیں۔ مرد اور عورتیں، سب اکتسابِ رزق کر سکتے ہیں۔ جو کچھ مرد کمائے وہ اس کا حصہ ہے۔ جو عورت کمائے وہ اس کا حصہ۔ رہا یہ امر کہ بات ہے کہ گھر کی زندگی میں میاں بیوی باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے، بعض باتوں میں مردوں کو برتری حاصل ہے اور بعض میں عورتوں کو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں اپنے آپ کو اپاہج بنا کر، مردوں کی کمائی کو تکتی رہیں اور خود کچھ نہ کریں۔ انہیں چاہیئے کہ خدا سے زیادہ سے زیادہ اکتساب کی توفیق طلب کرتی رہیں۔ خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کر سکتی ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ عورت کو جو کچھ زکہ میں ملے، وہ اس کی ملکیت ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی کمائی کی بھی آپ مالک ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گھر کا ماحول خوشگوار اور ازدواجی زندگی کامیاب ہو، تو میاں بیوی کے "تعلقات" کاروباری" نہیں رہتے۔ باہمی رفاقت اور تعاون کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ملکیت کی قانونی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جس میں قرآن نے عورتوں کو مردوں سے (یا بیوی کو مرد سے) پست درجہ پر رکھا ہو۔ ہمارے ہاں عورت کے متعلق جو خیالات رائج ہیں (اور جنہیں بدقسمتی سے قوانینِ شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے) وہ یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں سے مستعار لئے گئے ہیں۔ قرآن کا دامن ان سے پاک اور صاف ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت کا، عورت سے ضد، نفرت، تعصب کا یہ عالم ہے کہ زندگی میں تو ایک طرف، اس بے چاری کی موت کے بعد بھی یہ نفرت قائم رہتی ہے۔ ان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کو قتل کر دیا جائے تو اس کا خون بہا مرد کے خون بہا سے نصف ہوگا۔ عورت کی جان کی قیمت بھی مرد کی جان کی قیمت سے نصف ہے۔ جن کے تعصب کا یہ عالم ہو، ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عورت اور مرد کو ہم دوش تسلیم کر لیں گے، عبث ہے۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ مملکت کا قانون، قرآنی ہو۔

پردہ

اب ہم زیرِ نظر موضوع کے اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، اور چونکہ اس کا تعلق جذبات سے ہے اس لئے وہ نازک بھی بہت ہے۔ ہمارے اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری کے اندر بند رہنا چاہیئے۔ اور اگر انہیں (مصیبت کے مارے کہیں) گھر سے نکلنا پڑے تو وہ چلتا پھرتا خیمہ (WALKING TENT) نظر آئے۔ عورتوں کو اس ہیئت میں رکھنے کے لئے انہیں کسی اتھارٹی کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ کیا تھا کہ انہوں نے "اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے"۔ یہی صورت ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہے۔ ان کا ہر ارشاد فرمانِ خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہؐ سے بھی کہہ دیا تھا کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ..... (۶۶/۱) "جسے اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اسے حرام مت ٹھہراؤ"۔ لیکن احبار و رہبان کو اس کا لائسنس حاصل ہے کہ وہ خدا کے جس حلال کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ جس حرام کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں۔ اس باب میں عورت بیچاری ان کا سب سے پہلا اور بڑا ہدف ہے۔ اور اس کی ہر (خداداد) آزادی کو پابندیوں کی

زنجیروں میں جکڑ دینا، ان کا قابل فخر کارنامہ۔ پردہ اس کی شدید ترین شکل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حصہ لینے کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ان حضرات نے ان پر زندگی کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں۔

پردہ سے متعلق قرآنی تعلیم کے سمجھنے سے پہلے، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زمانۂ نزول قرآن میں رسول اللہ کی اولیں مخاطب قوم کی تمدنی اور معاشرتی سطح کیا تھی؟ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انہیں یہ بھی سمجھانا پڑتا تھا کہ چیخ چیخ کر بولنا اچھی عادت نہیں (۳۱/۱۹)۔ اکڑ کر چلنا معیوب ہے (۳۱/۱۸)۔ مجلس میں کھل کر بیٹھنا چاہیئے اور جب مجلس برخاست ہو تو اٹھ کر چلے جانا چاہیئے (۵۸/۱۱)۔ دوسروں کے ہاں جانا ہو تو اجازت لے کر جاؤ (۲۴/۲۷)۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز لینی ہو تو دروازہ سے باہر آواز دے کر مانگنی چاہیئے (۵۲/۳۳)۔ جب رسول اللہ تمہیں کھانے کے لئے دعوت دیں تو ایسا نہ کرو کہ ابھی ہانڈیاں چولھے پر دھری ہوں اور تم کھانے کے لئے جا بیٹھو۔ نہ ہی ایسا کرو کہ کھانے کے بعد وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگ جاؤ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے صاحب خانہ کو کس قدر تکلیف ہوتی ہے (۳۳/۵۳)۔ اس قوم کو اس قسم کے عام آداب معاشرت بھی وحی کے ذریعے سمجھانے اور سکھانے پڑتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی تمدنی سطح (بالعموم) کیا تھی اور انہیں مہذب سوسائٹی کی سطح پر لانے کے لئے کس قدر تدریجی تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ عورتوں کے ساتھ اختلاط و ارتباط کا سوال اس میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ جہالت کا علاج تو مناسب تعلیم و تربیت سے کیا جا سکتا تھا۔ لیکن (مدینہ میں) منافقین کی بھی خاصی تعداد تھی جن کا شیوہ ہی شرانگیزی تھا۔ عورتوں کے معاملہ میں شرانگیزی جس قدر آسان ہوتی ہے اسی قدر مہلک بھی۔ سورہ احزاب میں، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے فرمایا کہ اپنی بیویوں۔ بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہدو کہ وہ باہر نکلا کریں تو اپنے کپڑوں کے اوپر جلباب (OVER - ALL) پہن لیا کریں۔ اس حکم کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کی وضاحت بھی وہیں کر دی۔ یہ مستورات باہر نکلتیں تو منافقین ان سے چھیڑ خانی کرتے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے تو وہ جواب میں کہتے کہ ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا بازاری عورتیں۔ ان کی اس حجت کو پورا کرنے کیلئے مومن مستورات سے کہا گیا کہ تم جلباب پہن کر باہر نکلا کرو۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ (۳۳/۵۹)۔ اس سے تم پہچانی جاؤ گی (کہ تم شریف عورتیں ہو) اور یہ لوگ تمہیں ستائیں گے نہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر تمہاری اس احتیاطی تدبیر کے بعد بھی یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے مجرموں جیسا برتاؤ کرو۔ (۳۳/۶۰)۔

اس ایک واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے عورتوں کے گھروں میں رہنے اور باہر نکلتے وقت خاص احتیاط برتنے کی تلقین اور تاکید اس معاشرہ کے خصوصی حالات کا تقاضا تھی۔ یہ ابدی اور غیر متبدل احکام نہیں تھے۔ اصل چیز قرآنی تعلیم کی روح اور بنیاد ہے۔ وہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گی اور اس پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع حالات کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ جس طرح (مثلاً) جنگ کی ضرورت کی روح اور اصول تو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ جنگ لڑنے کے طرز طریق اور ذرائع و آلات زمانے کے ساتھ بدلتے رہنے والے۔

اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں پردہ کے متعلق قرآنی احکام و تعلیمات آسانی سے سمجھ میں آجائیں گی۔

تحفظ عصمت

جنسیات کے متعلق قرآنی تعلیم کی روح۔ اس کا اصل الاصول، تحفظ عصمت ہے جو قرآن کی متعین کردہ مستقل قدر ہے

وہ اس کا تقاضا مردوں اور عورتوں دونوں سے کرتا ہے۔ بلکہ مردوں کا نام پہلے لیتا ہے یَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (۲۴/۳۰) اور عورتوں کا بعد میں (یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ ۲۴/۳۱)۔ وہ مومن مردوں اور عورتوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ۔ (۳۳/۳۵) "اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور ایسا کرنے والی عورتیں"۔ لیکن ہمارے ہاں تحفظِ عصمت کا مطالبہ عورتوں سے کیا جاتا ہے، مردوں سے نہیں حتیٰ کہ عصمت کا لفظ بھی عورتوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ باعصمت یا اس کے برعکس، عصمت فروش، عورت ہوتی ہے، مرد نہیں۔ عورتوں کے تحفظِ عصمت کے لئے تو آئے دن ہنگامے بپا رہتے ہیں لیکن مردوں سے تحفظِ عصمت کے مطالبہ کے لئے کوئی تحریک نہیں چلائی جاتی۔ مذہبی حلقہ کی طرف سے یہ پراپیگنڈہ بھی عام

بداخلاقی پھیلانے کا ذمہ دار کون ہوتا ہے

کیا جاتا ہے کہ معاشرہ میں بداخلاقی پھیلانے کی ذمہ دار عورتیں ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مرد، بدکرداری کے لئے عورتوں کی طرف رجوع نہ کریں، تو عورتوں کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اگر کوئی بدنیت عورت، مردوں کے لئے بدکاری کی کشش بھی پیدا کرے، تو اگر مرد مستقل مزاج ہوں تو ان کی کشش و دعوت بھی بدکرداری نہیں پھیلا سکتی۔ بدکرداری کا عملی ارتکاب مردوں کی طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ مرد اس حقیقت کو تسلیم کریں، ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ بداخلاقی عورتیں پھیلاتی ہیں۔

مردوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔

عورتوں کو گھروں کے اندر بند کر دینے کے جواز میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ ان کے باہر نکلنے سے مردوں کا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ ہم جب بھی اس دلیل کو سنتے ہیں تو شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتے ہیں کہ مردوں کا ایمان اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ عورت کو دیکھنے سے متزلزل ہو جاتا ہے۔ تُف ہے ایسے ایمان پر جو اس قدر کمزور ہو! ایسے کمزور ایمان کو ایمان کہنا، لفظ ایمان کی تذلیل ہے۔ اگلے روز ایک معزز خاتون کو کہتے سنا گیا کہ اس سے پہلے ہمارے ذمے جو فرائض عائد کئے جاتے تھے، ان میں اب ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ مردوں کے ایمان کو قائم رکھنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ ہمیں گھروں میں بند رہنا چاہیئے "تاکہ مردوں کا ایمان نہ بگڑے" قرآن کریم نے اس کے لئے بطور حفظ ماتقدم یہ تدبیر بتائی کہ جب یہ باہر نکلیں تو اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ اور یہ سُن کر آپ متعجب ہوں گے کہ اس نے پہلے یہ تلقین مردوں کو کی ہے۔ (قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (۲۴/۳۰)۔ اور بعد میں عورتوں سے۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (۲۴/۳۱) لیکن مردوں کو اس کی توفیق کہاں کہ وہ اپنے آپ پر اتنا ضبط کر سکیں۔ کچھ سال اُدھر کی بات ہے پرویز صاحب کے درسِ قرآن میں (سندھ کے ایک رئیس) مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ درس میں حسبِ معمول، ایک طرف پوری پوری تمکنت اور متانت کے ساتھ، کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ مولوی صاحب نے کچھ وقت کے لئے تو ضبط کیا لیکن پھر کھڑے ہو کر باواز بلند کہا کہ ان "بیم صاحبوں" کو پردے کے پیچھے بٹھاؤ۔ ہمارا ایمان خراب ہو رہا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ آپ ان کی طرف نہ دیکھیں۔ کہا کہ ایسا کرنا مشکل ہے۔ سامعین نے اصرار کیا کہ وہ کمرے کے اندر تشریف لے جائیں۔ وہ طوعاً و کرہاً اندر چلے تو گئے لیکن چند ہی منٹوں کے بعد بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل آئے کہ ان چھوکریوں نے ہماری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ انہیں اندر بٹھانا چاہیئے۔ "مردوں کو ایمان بڑا عزیز ہے۔ اور اس کے قائم رہنے کا ایک ہی طریق ہے کہ عورتیں گھروں کے اندر بند رہیں۔

نظر بندی

عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دینا ایک سزا ہے جسے قرآن ان عورتوں کے لئے تجویز کرتا ہے جن سے کچھ بے حیائی کے آثار مترشح ہو رہے ہوں۔ یعنی وہ زنا کی مرتکب تو نہ ہوئی ہوں البتہ ان سے ایسی حرکات نمودار ہوں جو ناجائز جنسی تعلقات کی طرف لے جانے والی ہوں۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ (۴/۱۵)

اگر تمہاری عورتوں میں سے کسی سے ایسی بے حیائی کی حرکات سرزد ہوں (جو زنا کی طرف لے جانے کا) موجب بن سکتی ہوں، تو ان کے خلاف اپنوں میں سے چار گواہ لاؤ۔ (اگر اس طرح جرم ثابت ہو جائے تو) انہیں گھروں سے باہر آنے سے روک دو تاآنکہ انہیں موت آ جائے یا خدا کا قانون ایسی صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے رُک جائیں۔

اس وقت اس آیت کے دیگر مضمرات سے بحث مقصود نہیں۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ عورتوں کو گھروں میں بند کر دینا قرآن کریم کی رو سے جرمِ فحاشی کی سزا ہے۔

ہم نے زمانہ قبل از اسلام (عہد جاہلیت) کے عربوں کی تمدنی اور معاشرتی سطح کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے جس سے یہ حقیقت بار دگر واضح ہو جائے گی کہ ان کے عادات و اطوار کس قسم کے تھے۔ عہد رسالتمآبؐ کے مسلمان مرد اور عورتیں بھی اسی فضا کے پروردہ تھے۔ قرآن کے پیش نظر ان کی (دل کی گہرائیوں، بلکہ تحت الشعور تک میں جاگزیں) عادات و اطوار کی ایسی اصلاح تھی کہ وہ رفتہ رفتہ قرآنی قالب میں ڈھل جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے بعض اوقات ایسی پابندیاں عائد کرنے کی بھی ضرورت تھی جو عام حالات میں قدرے سخت نظر آئیں۔ اس پس منظر میں قرآن کے اصلاحی اقدامات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں اسی قسم کی اصلاحی تدابیر کا ذکر ہے۔ اس اصلاحی پروگرام کا آغاز خود حضورؐ کی اہل خانہ خواتین (نساء النبیؐ) سے کیا کیونکہ ان کی زندگی کو دوسری عورتوں کے لئے ماڈل بننا تھا۔ اسی لئے ان سے کہا گیا کہ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (۳۳/۳۲) تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ ان سے کہا کہ وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ (۳۳/۳۳)۔ تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھر میں رہو۔ تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد ہے وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (۳۳/۳۳)۔ برج کا مفہوم تو ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ یہاں یہ دیکھئے کہ ہم نے جو کہا تھا کہ قرآن کے پیش نظر ان مردوں اور عورتوں کے زمانہ جاہلیت کے اطوار و کردار کی اصلاح تھی اس کی تائید آیت کے ان الفاظ سے ہو رہی ہے۔ یعنی ان سے کہا گیا کہ وہ زمانہ جاہلیت کا سا تبرج جاہلانہ انداز اختیار نہ کریں۔

انہیں گھروں میں باوقار طور پر رہنے کا سلیقہ سکھایا گیا۔ پھر کہا کہ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۳/۳۲)۔ اگر تمہیں کسی غیر محرم سے بات کرنی ہو تو اپنی آواز میں ایسی نرمی اور لوچ نہ پیدا

ہوتے دو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو، غلط قسم کی آرزوئیں بیدار ہو جائیں۔ اس سے قاعدے کے مطابق عمدہ طریق سے بات کرو۔

اس آیت میں یہ نکتہ خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ نساءِ النبیؐ سے کہا جا رہا ہے کہ تم بات بھی اس انداز سے کرو کہ اس سے ایسے شخص کے دل میں جو برے خیالات لئے ہو، غلط آرزوئیں شدید بیدار ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہدِ جاہلیہ کے افرادِ معاشرہ کے قلب و نظر میں کس قسم کی آلودگیاں پیدا ہو چکی تھیں اور ان کی اصلاح کے لئے کس انداز کی تدابیر کی ضرورت تھی۔

زیب و زینت

قرآن کریم، زیب و زینت (تحسینِ حسن[1]) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ اس کے لیے اکرم اکرم پرویز صاحب کا وہ مقالہ دیکھ لینا چاہیئے جو آرٹ اور اسلام کے عنوان سے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن کریم نے زینت و آرائش کے متعلق کیا کہا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ....

(۷/۳۲)

اے رسولؐ! ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان اشیاء کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے بنایا ہے اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دے؟

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آرائش و زیبائش کو ممنوع قرار دینے والوں کو کس تحدی سے چیلنج کیا ہے؟ لہٰذا عورتوں (اور مردوں) کے لئے زیب و زینت کو کوئی ناجائز نہیں قرار دے سکتا۔

لیکن زیب و زینت کو اپنے جذبہ تحسینِ حسن (AESTHETIC SENSE) کی تسکین کا ذریعہ قرار دینے اور اس کی نمود و نمائش کرنے میں بڑا فرق ہے۔ عہدِ جاہلیہ میں اسے نمودِ حسن کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس جذبہ کی اصلاح کی۔ اس کے لئے اس نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ بڑا جامع ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (۳۳/۳۳) تم زیب و زینت کو عہدِ جاہلیہ کے جذبہ تبرّج کی تسکین کا ذریعہ نہ بناؤ۔

تبرّج کا مادہ (ب۔ ر۔ ج) ہے جس کے بنیادی معنی ابھارنے کے ہیں۔ (لفظ برج سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی)۔ اسی کو نمود و نمائش کہتے ہیں۔ لیکن اس کا نفسیاتی مفہوم اس سے گہرا ہے۔ ابریج اس طرح یا مشک کو کہتے ہیں جس میں دودھ بلویا جاتا ہے۔ دودھ بلونے سے اس میں جس قدر تحرک اور تلاطم پیدا ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ لہٰذا، تبرّج اس قسم کے نمودِ حسن اور نمائشِ زینت کو کہیں گے جس سے ان مردوں کے سینے میں، جن کا قلب و نگاہ آلودہ ہو، جذبات کا

---

[1] فطرت کی ہر شے کا حسن۔

تلاطم برپا ہو جائے۔ عہدِ جاہلیہ میں نمود حسن و آرائش سے یہی مقصود تھا۔ قرآن نے اسی سے منع کیا ہے۔ یعنی بالارادہ نمود حسن و زینت۔ اسی لئے کہا کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴/۳۱)۔ وہ اپنی زینت کو بالارادہ نمایاں نہ کریں۔ جو از خود ظاہر ہو جائے اس کا مضائقہ نہیں۔

ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ قرآن نے کن حالات کے تحت عورتوں کو جلباب کے پہننے کی تلقین کی تھی۔ یہاں کہا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (۲۴/۳۱)۔ انہیں چاہیئے کہ اپنے اوڑھنے کی چادریں اپنے سینہ پر ڈال لیا کریں۔ اس باب میں اس حد تک احتیاط ملحوظ رکھی کہ کہا کہ وہ چلیں تو اس انداز سے کہ پوشیدہ زینت (پاؤں کے زیور وغیرہ) کی جھنکار بھی سنائی نہ دے۔ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِن زِينَتِهِنَّ ۚ (۲۴/۳۱)

لیکن ان تاکیدات سے مقصد زیب و زینت کی مخالفت نہیں۔ ان احکامات کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ:

یہ (عورتیں) اپنی زینت کو نمایاں نہ ہونے دیں، بجز اپنے خاوندوں۔ اپنے باپ، سسر، اپنے بیٹے یا خاوند کے بیٹے (یعنی حقیقی یا سوتیلے بیٹے)۔ بھائی، بھتیجے۔ بھانجے۔ اپنی (جانی پہچانی) عورتوں یا ان غلام اور لونڈیوں کے (جو اس زمانے میں عربوں کے ہاں کام کاج کیا کرتے تھے) یا دیگر خدمتگاروں میں سے ایسے سن رسیدہ جو جنسی خواہشات سے گزر چکے ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کی پردے کی باتوں (جنسیات) سے ناآشنا ہوں۔ یعنی ان کے سامنے نمود زینت میں کوئی مضائقہ نہیں (۲۴/۳۱)۔

اظہار و نمود زینت کے علاوہ اس نے پرائیویسی کا بھی ایسا خیال رکھا ہے کہ بچوں اور ملازموں کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ صبح تمہارے اٹھنے (صلوٰۃ الفجر) سے پہلے۔ دوپہر کے وقت جب تم آرام کر رہے ہو۔ اور رات کے وقت (صلوٰۃ العشاء کے بعد) تمہارے کمرے میں آنا چاہیں تو اجازت لے کر آیا کریں۔ (۲۴/۵۸)

یہ ہیں پردے اور ستر زینت کے متعلق قرآنی احکام و ہدایات۔ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان سے مقصود ان خیالات کی تطہیر اور ان عادات و اطوار کی اصلاح تھا جو زمانہ قبل از اسلام (دورِ جاہلیہ) کی زندگی کا عام شعار تھے اور جو قرآن کے معاشرتی نظام میں فٹ نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ ان احکام کا مقصد یہ بتایا۔ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳/۳۳) "خدا چاہتا یہ ہے کہ تم سے قلب و نظر کی آلودگی کو دور کر کے تمہاری سیرت کو پاکیزہ بنا دے"۔ جنسیات کے سلسلہ میں دین کی بنیادی غایت تحفظ عصمت ہے، اور یہ تمام احکام اسی (عصمت) کے پاسبان ہیں۔ اسلامی حکومت (مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلامی حکومت) کا فریضہ ہوگا کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لے اور پھر دیکھے کہ اس مقصد کے حصول کیلئے کیا تدابیر اختیار کرنا ضروری ہیں۔ یاد رہے کہ جنسیات کی تطہیر نہ تو ڈنڈے کے زور سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی قوانین کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے۔ یہ گہرا نفسیاتی تقاضا ہے جسے دل سے ابھرنے والے خیالات کی تطہیر ہی سے کنٹرول میں رکھا جا سکتا ہے۔

تطہیرِ قلب و نگاہ

(یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق ہم وقتاً فوقتاً لکھتے چلے آ رہے ہیں)۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (۴۰/۱۹)۔ "خدا نگاہ کی خیانتوں اور دل میں پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے"۔ خیالات سے اس تقاضا کا کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اس کا اندازہ ایک پیش پا افتادہ مثال سے لگائیے۔ ایک آوارہ گرد نوجوان جو دن بھر

کسی "تازہ شکار" کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے، رات کو اپنے گھر میں ایسے کمرہ میں سوتا ہے جس میں اس کی نوجوان بہن بھی ہوتی ہے۔ اس کمرے میں ہی نہیں۔ گھر بھر میں کوئی تیسرا متنفس نہیں ہوتا۔ وہ اس تنہائی میں، اپنی ہمشیرہ کے ساتھ والے پلنگ پر سوتا ہے اور دست درازی تو ایک طرف، بہن کی طرف نگۂ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟ وہ اس جوان لڑکی کی طرف بدنگہی سے کیوں نہیں دیکھتا؟ اس لئے کہ اس کے دل میں یہ خیال راسخ ہے کہ بہن کے خلاف آلودہ نگہی سخت معیوب ہے[1]۔

قرآن، اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے اپنے نوجوانوں (لڑکوں اور لڑکیوں دونوں) کے قلب و نگاہ میں ایسی پاکیزگی پیدا کرتا ہے کہ ہر نوجوان لڑکا، اپنی بیوی کے سوا ہر لڑکی اور عورت کو بہن سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)، تو اس کے معنی یہی نہیں کہ مومن مرد آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ مومن عورتیں، مومن مردوں کی بہنیں ہیں۔ (قرآن کریم نے یہ لفظ بھائی اور بہن دونوں کے لئے استعمال کیا ہے) (۹/۷۱)۔ لہٰذا اگر مناسب تعلیم و تربیت سے، قلب و نظر کی تطہیر ہو جائے تو یہ سارے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر یہ نہ ہو تو دنیا کی کوئی طاقت یا کوئی قانون یا کوئی تدبیر اس کا حل پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ایسی تطہیر نہ ہو، اور جنسی جذبات بیباک ہوں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔

پری رُو تاب مستوری ندارند چو در بندی ز روزن سر بر آرند

حرفِ آخر

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ وہ بنیادی اصول جس پر یہ تمام عمارت استوار ہوتی ہے، آخر میں بیان کی جائے گی۔ اور وہ بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن، پیدائش کی رو سے انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، وہی جنت میں جا سکے گا۔ غیر بنی اسرائیل جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ یہ پیدائش کی رو سے، انسان اور انسان میں بڑی بنیادی تفریق تھی۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں پیدا ہو، یا غیر بنی اسرائیل کے گھرانے میں۔ غیر بنی اسرائیل کو ایک ایسے جرم کی سزا دینا جو اس کے بس کی بات ہی نہیں، خدا کے شایانِ شان نہیں۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور تاوقتیکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے کفارہ پر ایمان نہ لائے، وہ جنت کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی بچہ اپنے اختیار و ارادہ سے دنیا میں نہیں آتا۔ اس لئے انہیں اس بات کی سزا دینا کہ وہ انسانوں کے گھر کیوں پیدا ہوئے ہیں، اصولِ عدل کے یکسر خلاف ہے۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان پیدائش کی رو سے چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم ہوتے ہیں۔ برہمن (برہما کے

---

[1] (SEX PERVERTION) کی بات الگ ہے۔ وہ انتہائی شدید نفسیاتی مرض کی علامت ہوتی ہے جس کا تعلق مستثنیات (EXCEPTIONS) سے ہوتا ہے۔ ہم اوپر کی مثال میں، معمولات سے بحث کر رہے ہیں۔

سر سے پیدا ہوتے ہیں) اس لئے ہر قسم کی عزت و تکریم، بلکہ اقتدار کے مستحق ہیں۔
کھشتری (برہما کے بازوؤں سے پیدا ہونے کی وجہ سے) تخت و تاج کے وارث ہوتے ہیں۔
ویش (برہما کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) وہ کاروبار (بیوپار وغیرہ) کا کام کرینگے۔ اور
شودر (برہما کے پاؤں سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے) ان کا فریضہ باقی ورنوں (بالخصوص برہمنوں) کی خدمتگذاری ہے۔
انہیں درجۂ انسانیت حاصل ہی نہیں۔

اس تقسیم و تفریق کو بدلنے کا کسی کو حق حاصل نہیں ——— آپ غور کیجئے کہ اس تفریق و تقسیم کو برہما (خدا) کی طرف منسوب کرنے سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟

قرآن آیا اور اس نے بیک کلمہ (ابدی اصول) باطل کے ان تمام عقائد پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ اس نے کہا

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے تمام انسانوں کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

اس لئے پیدائش کے اعتبار سے کسی انسانی بچہ میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ خدا نے جس تعظیم و تکریم کا حامل "انسان" کو ٹھہرایا ہے۔ اس میں تمام انسان شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ "انسان" میں مرد اور عورتیں، دونوں شامل ہیں۔ اس لئے قرآن نے جو کچھ "انسان" (یا الناس) کے متعلق کہا ہے اس کا اطلاق مردوں اور عورتوں دونوں پر ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ کوئی لڑکا اپنے اختیار و ارادہ سے لڑکا پیدا ہوتا ہے، نہ کوئی لڑکی اپنے انتخاب (CHOICE) سے لڑکی۔ اب، لڑکی (یعنی عورت) کو لڑکے (یعنی مرد) سے کسی اعتبار سے بھی پست (INFERIOR) سمجھنا، پیدائشی تفریق کے اسی باطل عقیدہ کی طرف لوٹ جانے کے مترادف ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ بنابریں، مردوں کو عورتوں سے افضل سمجھنا قرآن کے اصل الاصول کے خلاف اور منشاء خداوندی کے منافی ہے۔ قرآن کی رُو سے، افضلیت، جوہر ذاتی (حسن سیرت و کردار اور اعمال) کی رو سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ پیدائش کی رُو سے۔ اور اس اصل الاصول میں مرد اور عورتیں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ یہ تمام خیالات و عقائد جن کی رُو سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں جنسِ کاسد سمجھا جاتا ہے، اس "اسلام" کے پیدا کردہ ہیں جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا، جس میں عورتیں منڈیوں میں نیلام ہوا کرتی تھیں۔ ہماری فقہ کی کتابیں، عورتوں کی خرید و فروخت سے متعلق "مسائل" سے بھری پڑی ہیں۔

قرآن کریم نے نمود و زینت کو جو مستحسن قرار نہیں دیا، تو اس میں بھی عورتوں کے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ عیسائیت (اور یہودیت) میں عورت کی تخلیق (یعنی آدم کی پسلی سے پیدا ہوتے) کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آدم (مرد) کے بہلاوے کا ذریعہ بن سکے۔ یعنی ان کے نزدیک عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ آدم (مرد) کے ایک تقاضا کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسے مرد کے کھلونے کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے اس باطل تصور کو بھی مٹایا اور کہا کہ مرد اور عورت دونوں کی تخلیق مقصود بالذات ہے ——— نہ مرد عورت کے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، نہ عورت، مرد کے کسی مقصد کے پورا کرنے کا ذریعہ۔ یہ دونوں خدا کے پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے یکساں ذرائع ہیں۔

عورت کا مقامِ بلند

قرآن نے تو یہ بتایا۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورت کے دل میں اس خیال کو کوٹ کوٹ کر بھرا گیا کہ اس کی تخلیق مقصود بالذات نہیں، بلکہ مردوں کے ایک تقاضا کے پورا کرنے کا ذریعہ ہے اس سے غیر شعوری طور پر یہ خیال عورت کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو گیا کہ اس کا مقصدِ حیات مردوں کا کھلونا بننا ہے۔ عورت کی طرف سے غیر مردوں کے سامنے حسن و زینت کی نمود کا جذبہ، غیر شعوری طور پر اس تقاضا کا پیدا کردہ ہے کہ وہ ان کی نگاہوں میں پُرکشش بن جائے۔ آپ نے اس پر بھی غور فرمایا کہ قرآن کریم نے جو باپ، بھائی، بیٹے وغیرہ کے سامنے نمود زینت کو معیوب قرار نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے نمودِ حسن کا جذبہ پُرکشش بنتا نہیں ہوتا۔ آپ ذرا قرآن کی ان باریکیوں کو بنگاہِ تعمق دیکھئے کہ اس نے نمود حسن و نمائش زینت کے خلاف احکامات کے ملحق (دوسری ہی آیت میں) عورتوں سے کہا ہے کہ تم تو زندگی کے کسی گوشے میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہو، اس لئے تمہارے دل میں مردوں کا کھلونا بننے کا جذبہ کیوں کارفرما ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔ اس نے کہا کہ

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔ (۳۳/۳۵)

یاد رکھو ہم نے مردوں اور عورتوں، دونوں میں اس امر کی استعداد رکھ دی ہے کہ وہ

۱۔ قوانین خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوں۔

۲۔ ان قوانین کی محض میکانکی طور پر اطاعت نہ کریں، بلکہ دل کی گہرائیوں میں، ان کی صداقت اور نتیجہ خیزی پر ایمان رکھیں۔

۳۔ اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانین خداوندی کی رو سے ہے۔

۴۔ وہ عہد جو انہوں نے اپنے خدا سے باندھا ہے (۹/۱۱۱)، اسے سچ کر دکھائیں۔

۵۔ مشکلات اور مصائب کے مقابلہ میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہیں۔

۶۔ نوعِ انسان کی خدمت کے لئے شاخِ ثمردار کی طرح جھکے رہیں۔

۷۔ اپنی ہر متاع کو، نظامِ خداوندی پر نچھاور کر دینے کے لئے تیار رہیں۔

۸۔ قوانین خداوندی نے جہاں جہاں سے رُکنے کا حکم دیا ہے، وہاں سے رکیں۔ ان پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان کا پورا پورا خیال رکھیں۔

۹۔ اپنی عفت و عصمت کی پوری پوری حفاظت کریں۔

۱۰۔ غرضیکہ زندگی کے ہر قدم پر، قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھیں۔

یہ ہیں وہ لوگ جنہیں خدا کا قانونِ مکافات، زندگی کی ہر تباہی سے محفوظ رکھے گا۔ اور انہیں، ان کی سعی و عمل کا اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ اس باب میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ (۳/۱۹۴ ؛ ۴/۱۲۴)

قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ مرد اور عورتیں کارگاہِ حیات میں یکساں صلاحیتوں اور استعدادوں کی مالک ہیں، پھر تمہارے

دل میں یہ جذبہ کیوں بیدار ہو کہ تم نمائشِ زینت سے مردوں کی نگاہ میں پُرکشش بنو۔ تم کوئی جنس (COMMODITY) نہیں ہو جسے خریداروں کے لئے پُرکشش بنا دیا جاتا ہے کہ اس کی قیمت بڑھ جائے۔ جو عورتیں اس کے باوجود اپنے دل سے اس خیال کو نکال نہ سکیں وہ ان سے کہتا ہے کہ

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ ... (۷/۱۷۶)

ہم تو چاہتے تھے کہ تمہیں، قرآن کے ذریعے، آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں، لیکن تم ہو کہ اپنے پست جذبات کے پیچھے لگ کر زمین کی پستیوں کے ساتھ چپکے رہنا چاہتی ہو!

یعنی ان کے لئے خدا کا پیغام یہ ہے کہ:-

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو!
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گئی!"
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اور یہی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علومِ حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلۂ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے ـــــ قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک ـــــ ملنے کا پتہ:-

(۱) مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور

کیا سائنس

انسانی زندگی پیدا کر سکتی ہے؟

آپ نے بہت کم ایسا دیکھا ہوگا کہ طلوعِ اسلام میں دیگر جرائد میں شائع شدہ مضامین نقل کئے گئے ہوں۔ اس کی وجہ اس کی (خدانخواستہ) "انانیت" نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ایک خاص مسلک ہے۔ خاص موضوع ہے۔ خاص اسلوب ہے۔ خاص انداز ہے۔ اس کی ساری فکر، قرآنِ کریم کے مرکز کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ زندگی کے مسائل کا حل اس کی روشنی میں تلاش اور پیش کرتا ہے۔ یہ انداز کہیں اور نہیں ملتا اس لئے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دیگر جرائد یا مجلات میں شائع شدہ مضامین اس کے اس مسلک کے ہم آہنگ ہوں۔ لیکن اگر کہیں ایسی تحریر مل جائے تو وہ اسے مستعار لے لینا اپنے لئے باعثِ عار نہیں سمجھتا بلکہ اسے شکریہ کے ساتھ اپنے ہاں منتقل کر لیتا ہے۔ اس قسم کا ایک مقالہ ہے جو روزنامہ نوائے وقت کی میگزین ایڈیشن (بابت ۵ فروری ۱۹۸۲ء) میں محترم عبدالرشید زائر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اسے ہم صاحبِ مقالہ اور مؤقر ہم عصر کے شکریہ کے ساتھ درجِ ذیل کرتے ہیں۔ مقالہ سے ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ ہے لیکن صاحبِ مقالہ نے یہ نہیں بتایا کہ اصل مضمون کہاں شائع ہوا تھا۔ اگر اس کا حوالہ دے دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ کہتا تھا کہ ہم اسے بعض ضروری وضاحتوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی رُو سے، زندگی (LIFE) خدا کی پیدا کردہ ہے، خواہ وہ سالمہ کی ابتدائی شکل میں ہو، اور خواہ انسان کی ارتقاء یافتہ صورت میں۔ انسان، زندگی کی مضمرات کے متعلق سائنٹفک طریق سے تحقیقات تو کر سکتا ہے، لیکن زندگی پیدا نہیں کر سکتا۔ آج کل بعض گوشوں میں یہ خیال ابھر رہا (یا ابھارا جا رہا) ہے کہ زندگی کسی آفاقی قوت کی تخلیق نہیں (یہ لوگ خدا کی ہستی ہی کے منکر ہیں) سائنس اس سمت میں مصروفِ تحقیق و کاوش ہے۔ اس لئے یہ عین ممکن ہے کہ انسان، کسی دن زندگی پیدا کرنے پر بھی قادر ہو جائے۔ زیرِ نظر مضمون اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ ایک نامور سائنسدان کے اعترافات پر مشتمل ہے۔ مضمون زیادہ تر تکنیکی ہے اس لئے اسے دقتِ نظر سے سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ یہ کسی انٹرویو کا ترجمہ نظر آتا ہے اس لئے "سوال و جواب" کے انداز کی وجہ سے قدرے سہل اور دلچسپ ہو گیا ہے۔ امید ہے قارئین اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے۔

اس قسم کی تحقیقات اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن اصل سوال تو وہ ہے جسے اقبالؒ نے چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے کہ ؎

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے — کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں، میری انتہا کیا ہے

قرآن اسی انتہا (یا آخروی زندگی) کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس لئے کہ موجودہ زندگی میں تو انسان نے جو کچھ، اور

جس طرح، بننا تھا بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد یہ کیا بننا چاہتا ہے۔ یہ سوال سائنسی تحقیقات کے دائرے میں نہیں آتا۔ سائنس صرف اس کی طبیعی زندگی کے متعلق بحث یا تحقیق کر سکتی ہے۔ اور اس نے اس کے بعد جو کچھ بننا ہے، اس کا تعلق اس کی طبیعی زندگی سے نہیں۔ اس کی طبیعی زندگی تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے اس کی ذات نے جانا ہے، اور اس کی ذات (SELF) سائنس کی گرفت میں نہیں آ سکتی۔ اس کا تعلق اقدار سے ہے جو (زندگی اور ذات کی طرح) خدا کی عطا فرمودہ ہیں۔ اور قرآن کی دفتین میں محفوظ۔ اسی لئے اقبالؒ نے، قرآن کا مقصد اور منصب یہ بتایا ہے کہ:

آنچہ حق، می خواہد آں سازد ترا

"قرآن تجھے وہ کچھ بنا سکتا ہے جو کچھ، خدا چاہتا ہے کہ تو بن جائے۔"　　(طلوعِ اسلام)

(۰)

ایک سائنسدان کے اعترافات

سوال:- پروفیسر میفرڈ آئیگن صاحب! جیسا کہ آپ کا تعلیمی ادارہ اپنے طویل نام "انسٹی ٹیوٹ فار بائیو فزیکل کیمسٹری" کی وجہ سے مشہور ہے اس میدان کے ماہرین اور آپ کے شاگردوں کے علاوہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس نام میں سائنس کی تین شاندار ترین شاخوں کا عندیہ ملتا ہے۔ جو تحقیق آپ کر رہے ہیں اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی کے آغاز کا کھوج لگایا جائے۔ آپ یہ بتایئے کہ آج کی بیالوجی کس حد تک ٹسٹ ٹیوب میں مصنوعی طریقوں سے زندگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکی ہے؟

جواب:- میں بڑے اعتماد کے ساتھ آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ دنیا کا کوئی شخص خود مختار اور فطری زندگی کا ایک ذرہ بھی مصنوعی طور پر یا ٹسٹ ٹیوب میں تیار نہیں کر سکتا۔ یہ سوال ہی خارج از بحث ہے۔ زندگی کی پیچیدگیاں اور گہرے راز اس قدر وسیع ہیں کہ انسانی عقل اس میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

سوال:- چلئے یہ تو مان لیا! مگر حیوانی جسم کی ہیئتِ اجتماعی یا ساخت یا نظام میں محض چند یا ایک خلیئے (CELL) کا زندگی میں کیا کردار ہے؟ جیسا کہ اب تک کی جدید ترین سائنسی تحقیق اس نظریئے پر پہنچی ہے کہ زندگی کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے اور پھر ارتقائی منزلیں طے کر کے انسان معرضِ وجود میں آیا!!

جواب:- جی ہاں! میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں۔ مگر کون کہتا ہے کہ زندگی کا یہی آغاز تھا؟ زندگی یا حیوانی مادے کے لئے کون حدِ فاصل قائم کر سکتا ہے۔ ایک جاندار اور بے جان کے درمیان خطِ امتیاز میں سب سے بڑی وضاحتی مثال وائرس یا زہریلے مادے کی دی جاتی ہے۔ مگر یہ بھی خود مختار انسانی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے سے قاصر ہے۔ یہ تو محض قیاس آرائیاں ہیں جو ہنوز تجرباتی مراحل میں ہیں۔ پھر بھی ایک بات قابلِ غور ہے کہ وائرس کے اجزاء بالکل حیاتی زندگی کی ہیئتِ مجموعی اور ساخت کی طرز پر ہی پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ یہ پیدا ہو کر بالکل ویسا ہی ماحول اپناتے ہیں جیسا بکٹیریا کا مادہ حیات میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس بات کے حوالے سے میں شاید یہ کہہ سکوں گا کہ وائرس ہی زندگی کی سب سے ابتدائی شکل ہے مگر یہ خود کار فطری نظامِ زندگی سے

مادۂ حیات میں تبدیل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بہرحال اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ حقیقی زندگی کی ہیئت سے بالکل الگ تھلگ ہو کر ایسے مصنوعی ماحول کے تحرکات پیدا کر سکیں جو اس کے لئے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر سائیگل مان نے اپنے تجربات میں ایک نلکی میں مصنوعی ماحول پیدا کر کے وائرس کو بکٹیریا میں اور ان کو دوبارہ وائرس میں تبدیل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں اس سے آپ کے سوال کا جواب نہیں ملتا۔ دراصل ہم بیالوجسٹ اس بات میں دلچسپی نہیں رکھتے کہ ہم زندگی کو ٹیسٹ ٹیوب میں مصنوعی طور پر پیدا کریں۔ ہم تو محض اس کے لوازمات پیدا کرنے کے تجربات کر رہے ہیں۔ بعض اوقات پریس والے اپنی لاعلمی کی وجہ سے ہمارے تجربات کو غلط حوالے سے شائع کر دیتے ہیں جس سے ایک عام قاری لفظ "زندگی" کو انسانی زندگی سمجھنے لگ جاتا ہے۔

سوال:۔ تو کیا آپ کے خیال میں مصنوعی طریقے سے انسان بنانا قطعی طور پر ناممکن ہے؟

جواب:۔ جی ہاں! میں تو یہی کہوں گا کہ کبھی نہیں۔ حالانکہ سائنسی تجربات کی رُو سے لفظ "کبھی نہیں" استعمال کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کیمیائی مرکبات اور آمیزش سے مصنوعی طور پر انسان کی ہیئتِ مجموعی یا پیچیدہ نظام والی زندگی مصنوعی طور پر بنا لینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ میں آپ کے ہی سوال کو ذرا دیگر شکل میں دہرا کر پوچھتا ہوں کہ کسی مجسم خلیئے (Cell) کا پیچیدہ انسانی نظامِ جسم کی زندگی اختیار کر لینا آسان ہے یا مشکل۔ تو اس کا جواب میں "ہاں" میں دوں گا۔ کم از کم اساسی سطح کے مطمعِ نظر کے طور پر یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک خلیئے (Cell) کو لے کر اسے بیضوی یا تخمی جرثوموں میں کاشت کر دیا جائے جس سے سالمے کے مرکز یا اصل کا کھوج لگ جائے۔ لیکن یہ قطعی طور پر ناممکن نہیں کہ انسان کی طرح کے عاقل انسان کی پیدائش کے محرکات یا ماحول کے کیمیائی مرکبات تیار کر لئے جائیں۔ کیونکہ انسانی نظامِ جسم یا ڈھانچہ ۳۰ کروڑ کیمیائی اجزا پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر آپ ان اعداد و شمار پر مشتمل اجزا کو لفظوں میں لکھنا چاہیں تو اس سے دس ہزار ضخیم کتابوں کی ایک لائبریری بن جائے گی۔ اور اگر اس کی تفصیل لکھنا چاہیں تو یہ بہت مشکل کام ہوگا۔ کیونکہ انسانی عقل .... انسان کے میکانکی نظام کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کوئی بھی عالم فاضل ترین بیالوجسٹ اس قسم کی باتیں سوچنے یا تجربات کرنے میں معمولی سی دلچسپی بھی نہیں رکھتا۔ سائنس نے ہماری عقل و دانش اور علم کو بڑھانے میں بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن کیا کوئی سائنسدان اس بارے میں دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے انسان کی ابتدار یا اصلِ انواع کا کھوج لگا لیا ہے؟ ہرگز نہیں!!

ہم تو ابھی تک انسانی نظامِ زندگی کے واقعات یا نظریاتی استنباط کی تہہ کھول رہے ہیں اور ہمیں بہت ہی معمولی علم ہو سکا ہے۔ یوں سمجھئے ہم اس سمندر کا ایک قطرہ حاصل کر سکے ہیں۔

اب میں اس سوال کی طرف لوٹتا ہوں کہ آیا ٹیسٹ ٹیوب میں زندگی پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

ہمارے تجربات میں حقیقی طور پر یہی مقصد کارفرما ہے۔ ہم یہی کھوج لگا رہے ہیں کہ زندگی کرۂ ارض پر کس طرح اُبھری تھی۔ یقین کیجئے ہمارا قطعاً یہ مقصد نہیں کہ ہم زندگی کو اس کی مکمل پیچیدگیوں کے ساتھ

پیدا کر لیں، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ زندگی کو معرضِ وجود میں آنے کے لئے لاکھوں کروڑوں سالوں کا سفر طے کرنا پڑا تھا تو ہم اپنی فانی زندگی کے چند سالوں میں اس کا کھوج کیسے لگا سکتے ہیں۔ ہم محض اپنے تجربات کر کے آپ ہی چند مخصوص سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سوال:- اچھا یہ بتائیے وہ کونسے حالات تھے جس نے کرۂ ارض پر زندگی کو ممکن بنایا؟

جواب:- کرۂ ارض پر زندگی کے لئے چند مخصوص خواص، عناصر اور حالات کی ضرورت تھی۔ جب ربِّ کائنات نے یہ پیدا کر دیئے تو زندگی اُبھر آئی۔ آج جب ہم ان حالات کو یا موجودہ زندگی کو جوہری سطح پر دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے لئے حالات پہلے سازگار بنائے گئے تھے۔ علمِ طبیعیات اور علمِ کیمیا کے قوانین سے ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ جانداروں نے کس طرح حالات کی شدت میں بھی اپنی بقا کا انتظام کر لیا تھا مگر جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب اس میں مزید انقلابی تبدیلیاں یا ذیر و زبر ممکن نہیں۔ اب جانداروں کے نظامِ زندگی میں کوئی مزید ترقی نہیں ہو سکتی۔ زندگی کا عمل اپنی انتہا کو پہنچا تو پھر انسان پیدا ہوا تھا۔ زندگی بہرحال سالماتی نظام کے تحت معرضِ وجود میں آئی تھی۔ آج سائنس نے اس سالماتی نظام کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ نظام نیوکلیک ایسڈ یعنی جوہری تیزابوں کے تحت کام کرتا ہے۔ اب تک کے تجربات سے ہمیں یہی علم ہوا ہے کہ سب سے پہلے (RIBONUCLEICACIDS) معرضِ وجود میں آئے تھے اس کے بعد (DESOXY RIBONUCLEIC) ایسڈ بنتے گئے۔ جنہوں نے انتہائی فہم و ادراک اور عقل و دانش کو جنم دیا۔ اور اسے سوچنے سمجھنے کے قابل بنایا۔

سوال:- تو پھر یہ نیوکلیک ایسڈ جو زندگی کے لئے اتنے اہم ہیں کیا از خود بن گئے تھے؟

جواب:- اس بات کی مکمل توجیہہ یا انکشاف بہت مشکل ہے۔ یہی تو ایک سوال ہے جس میں لیبارٹریوں میں تجربات ہو رہے ہیں کہ کس طرح اور کتنے سالمے معرضِ وجود میں آئے اور پھر زندگی کی ابتدا ہوئی۔

سوال:- آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ کرۂ ارض پر کسی نادیدہ طاقت نے وہ حالات پیدا کئے جو زندگی کے لئے ضروری تھے۔ اور ان حالات کو آج تک قائم رکھا!؟

جواب:- آج ہمیں جس بات میں سب سے زیادہ دلچسپی اور جستجو ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان سالموں کو جو کسی مخصوص حالت میں نہیں، کو لے کر لیبارٹری یا شیشے کی صراحی میں پرورش کریں۔ لیکن پھر ایک پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے کہ کیا ہم اسے ایک خلئے (CELL) کی موجودگی کے بغیر خود کار میکانکی نظام میں پیش کر سکتے ہیں؟ اس کا ہمیں اثبات میں جواب مل چکا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فطری ماحول میں طبیعیات از خود معرضِ وجود میں آ کر آگے بڑھتی ہیں۔ طبیعیات کا فطری ماحول میں مقید ہو جانا لازمی امر ہوتا ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں ہمیں کافی توقعات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کا یقین کریں یا نہ کریں۔ جب مخصوص قسم کے کیمیائی مرکبات تیار ہو جائیں گے تو اتفاقی یا زمانی مطابقت کا عمل میں آ جانا کسی حد تک ممکن ہو گا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے بارے میں قبل از وقت کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔ ہم اپنے تجربات جاری رکھتے ہیں کامیابی غیر متوقع طور پر کسی وقت بھی سامنے آ سکتی ہے۔ ہم اس نادیدہ طاقت کے پیدا کردہ ماحول سے ہی سب کچھ حاصل کرتے ہیں۔ ہم نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ بار آور سالمے مخصوص مقصد کے لئے فوری

طور پر ابھر آتے ہیں اور پھر زیادہ مکمل شکل میں پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں کئی لوگ اب بھی اس عمل کو غیر یقینی مطابقت زمانی کے زاویہ سے دیکھتے ہیں مگر فی الحقیقت یہ ایک ایسا میکانکی نظام ہے جو خدا کا پیدا کردہ ہے جس کے نتیجے میں یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہم اس سائنسی ادارے میں انہی اٹل اصولوں کے پس منظر میں اپنے مطالعہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

سوال:۔ چنانچہ آپ زندگی کی ابتدا کا کھوج لگانے کے لئے تجربات کر رہے ہیں؟

جواب:۔ جی ہاں! حالانکہ ہمارے تجربات اُس سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ جو عام انسان گلیوں میں سمجھتے ہیں۔ ہم اپنا وقت اس بات میں ضائع نہیں کرتے کہ ہم رقیق قسم کے مائع جات کو محنت اور وقت سے صرف یا شربت کی طرح ابالتے پھریں۔ اور پھر اس انتظار میں رہیں کہ ڈیپارٹ سے کیا جنم لیتا ہے۔

ہم چند خاص قسم کی میکانیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب ہمیں کچھ اخذ ہو جاتا ہے تو ہم اس کو ریاضی کی زبان میں تحریر کر کے ایک فارمولا تخلیق کر لیتے ہیں۔ جب ہم کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں تو یہ ایک زوردار منطق ہوتا ہے جو ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوا۔ اس سے ہمارے قیاسی سوالات کا جواب ملتا ہے اور ہم زندگی کی ابتدا کے نظریئے کے قریب پہنچنے لگتے ہیں۔

سوال:۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ جو... کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فطرت کے جن موجودہ اصولوں یا حالات کے تحت زندگی معرضِ وجود میں آئی اور جس میں لاکھوں کروڑوں پیچیدہ عوامل ہیں یہی زندگی کی موجودہ شکل کا موجب بنی؛ میں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا زندگی کسی دیگر شکل میں بھی وجود میں آسکتی تھی؟

جواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر معاملے میں جسمانی ساخت کے مظہرات میں اختلاف ہو سکتا تھا۔ آخر ہمارے کرۂ ارض پر زندگی ایک ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے اگر یہی احوال، حالات، عناصر یا عوامل کسی اور کرّے پر ملیں تو وہاں بھی زندگی ضرور ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ذی حیات کی شکل قدرے مختلف ہو۔ اگر کسی کرّے پر بالکل اسی طرح حالات پیدا ہوئے ہوں جس طرح کرۂ ارض پر شروع ہوئے تھے تو آپ یقین کریں کہ اس قسم کے طبعی یا موسمی حالات ایسا باورچی خانہ ثابت ہو سکتے ہیں جس میں زندگی تیار ہوتی ہے۔ پھر سو فیصد یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری بائیو کیمسٹری ہمیں اس چیز کو پانے میں مدد کر سکتی ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں۔

سوال:۔ بہت سے سائنسدان کہتے ہیں کہ ان کا کام علمی تشنگی دور کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ آپ کے خیال میں زندگی یا ذی حیات چیزوں پر اس قدر عرق ریزی کرنے کا یہ نظریہ صحیح اور منصفانہ ہے؟

جواب:۔ تحقیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اس دنیا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں جس میں ہم رہتے ہیں جب ہم اپنے تجربات میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں تو اس کا منطقی تاثر یہ لیا جاتا ہے کہ ہم قدرت کے کاموں میں دخل اندازی کر رہے ہیں پھر میں اپنے آپ سے خود یہ سوال کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں کیا یہ اخلاقی طور پر حق بجانب ہے؟ اگر کسی جانور پر میرا تجربہ مجھے اس قابل بناتا ہے کہ میں انسانی زندگی بچا سکوں گا تو پھر میں یہ تجربہ جاری رکھتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ دیکھئے انسان اپنی خوراک کے لئے جانوروں کو ہلاک کرتا ہے میں لوگوں میں یہ احساس اجاگر کرنا چاہتا ہوں کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو ہلاک کرے کسی بھی صورتِ حال میں نہیں۔ کسی کو بھی یہ حق نہیں دیا جانا چاہیئے۔ انسان یا انسانی زندگی قدرت کا عظیم کارنامہ ہے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کو بچانا ہمارا اوّلین فریضہ ہونا چاہیئے۔ اگر میں اپنے نظریئے میں تھوڑی سی کامیابی بھی حاصل کر سکا تو میرا یہ عظیم اقدام ہوگا۔

——— (•) ———

ادارہ کے لئے ضرورت

ادارہ طلوعِ اسلام کے لئے ایک ایسے قلم کار کی ضرورت ہے جس کی اُردو زبان کی استعداد کافی ہو۔ جو املا لے سکتا ہو، اور کاپیاں جن میں قرآنی آیات بکثرت ہوتی ہیں، بڑی دِقتِ نظر اور احتیاط سے چیک کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ معاوضہ معقول دیا جائے گا۔ البتہ رہائش کی ہمارے ہاں گنجائش نہیں ہوگی۔ خواہش مند احباب کو تاریخِ مقررہ پر ملاقات کے لئے بھی تشریف لانا ہوگا۔ درخواستیں، ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵/بی - گلبرگ ۲ کے نام، ۱۵ر جون ۱۹۸۲ء تک پہنچ جانی چاہئیں۔

رِشتوں کی ضرورت

(۱)

ارائیں برادری سے متعلق، ایک نہایت شریف، مہذّب، زمیندار خاندان کی ناکتخدا لڑکی کے لئے انہی صفات کا حامل رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی میٹرک تک تعلیم یافتہ اور مشرقی اور اسلامی روایات کی پابند ہے۔ لڑکے کا برسرِ روزگار ہونا ضروری ہے، خواہ ملازمت ہو اور خواہ کاروبار۔ معیارِ انتخاب شرافت و نجابت ہوگا، نہ کہ دولت۔ خط و کتابت بصیغۂ راز۔

(م - ش - معرفت، ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور)

(۲)

ناکتخدا لڑکی کے لئے جس کی عمر قریب تیس سال ہے۔ تعلیم ایم اے - ایل ایل بی - آجکل ایم ایڈ کی تیاری کر رہی ہے۔ لڑکا تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار ہو۔ شرافت اور حسنِ اخلاق کے سوا کوئی مطالبہ نہیں۔

(۳)

دوسری ناکتخدا لڑکی عمر قریب ۲۸ سال ہے۔ تعلیم ایم اے۔ سائیکالوجی۔ آجکل ایم اے۔ فلسفہ کی تیاری کر رہی ہے۔ لڑکا برسرِ روزگار اور شرافت اور حسنِ اخلاق سے مزیّن ہو۔ اور کوئی مطالبہ نہیں۔

(م - ص - معرفت ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور)

(۴)

ارائیں خاندان کے ایک نوجوان لڑکے کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ عمر قریب ۲۶ سال، تعلیم ایم ایس سی۔ اعلیٰ عہدہ پر فائز اور صاحبِ جائداد۔ (ا - م - معرفت ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور)

باسمہٖ تعالیٰ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید، جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

کہاں مَیں کہاں یہ مقام، اللہ اللہ!

پرویز

جب سے میرے شعور نے آنکھ کھولی، ایک نہایت حسین و تابناک آرزو کو دل کی گہرائیوں میں مچلتے، انگڑائیاں لیتے پایا۔ یعنی ارضِ حجاز کی خاک بوسی کی آرزو۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی، یہ آرزو جوان سے جوان تر ہوتی چلی گئی۔ اس دوران میں میں نے اس ارضِ مقدس کے کوہساروں، صحراؤں، وادیوں، میدانوں، گلیوں، کوچوں اور رشکِ صد طور جلوہ گاہوں سے متعلق ہزارہا صفحات لکھے —— جگر کے گداز، دل کے سوز اور آنکھوں کی شبنم فشانیوں کے ساتھ لکھے، لیکن یہ سب میرے تخیلاتی یا مطالعاتی نقوش پر مبنی تھے —— اور تصوراتی اور مشاہداتی نقوش میں جو فرق ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ جوں جوں میں لکھتا جاتا تھا، تکرارِ موسویؑ کی طرح شوقِ دید تیز تر ہوتا جاتا تھا لیکن اس کی تسکین کا کوئی سامان مہیا نہیں ہوتا تھا۔ چند سال اُدھر سے میری عمر رسیدگی اور مسلسل صحت کی خرابی کی بنا پر، اس کی امید بھی افسردہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ سالِ گذشتہ کے ناقابلِ برداشت حوادث نے اس چراغِ تہ داماں کو قریب قریب گل کر دیا تھا۔ میرے اعصاب پر اس ناامیدی کا بھی اثر بڑا شدید تھا۔ میں دن بدن مضمحل ہوتا جا رہا تھا اور جی رہا تھا تو صرف اس قرآنی مشن کے سہارے، جسے میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ میرے قریبی احباب اس صورتِ حالات سے بڑے مشوش تھے —— لیکن، ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کرے!

گذشتہ مارچ، اسی تشویش سے متاثر ہو کر، میرے قریب ترین قرآنی عزیز، عمر دراز خان، کویت سے لاہور آئے۔ میں نے اپنے متعلق انہیں ہزار مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان جھوٹی تسلیوں سے ان کا جی نہ بہلا۔ انہوں نے احباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ ان کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ مجھے کسی نہ کسی طرح موجودہ ماحول سے نکال لیا جائے جس کی فضا بڑی غم آلود

ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے کافی کوشش کی ہے کہ انہیں کسی صحت افزا مقام پر لے جایا جائے۔ لیکن یہ اس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ عمر دراز خان نے کہا کہ انہیں اس فضا سے نکالنے کے لئے بڑی زبردست کشش کی ضرورت ہے۔ اور میں اس کشش کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اور انہوں نے ایک دن، بلا کسی تمہید کے مجھ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو مدینہ منورہ لے چلوں۔ اس کے لئے سب انتظام مکمل ہے۔ آپ تاریخ کا تعین کر دیجئے۔

میں نے یہ سنا تو میری آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا۔ میرے عروقِ مردہ میں برقِ تپاں کی لہر دوڑ گئی۔ میرے قلبِ حزیں میں یوں سمجھئے گویا امیدوں کے دروازے کھل گئے۔ مجھے حیاتِ تازہ کا پیام مل گیا۔ حیرت اور مسرت کے جذبات اس قدر تلاطم خیز تھے کہ میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سب کچھ سمجھ لیا اور کہا کہ پروگرام یہ ہے کہ یہاں سے پہلے کویت چلیں۔ وہاں سے قرآنی احباب کا ایک قافلہ ہمرکاب ہوگا۔ خشکی کے راستے، مختلف مقاماتِ مقدسہ سے تزکیۂ بصیرت حاصل کرتے آگے بڑھتے جائیں گے۔ راستے میں دہران۔ ریاض۔ طائف وغیرہ کے قرآنی احباب بھی چشم براہ ہیں۔ اس کے بعد ——— اس کے بعد ان کی آواز رندھ گئی۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

برادرِ گرامی میاں ظفر محمود (منیجر قانونی فوجی فاؤنڈیشن) اتفاق سے پاس ہی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ انہیں سفر کا کوئی مرحلہ بھی تنہا طے نہیں کرنے دینا چاہیئے۔ میں قدم اول سے آخر تک ساتھ رہوں گا۔

اور یوں میری زندگی کی شاخِ خزاں دیدہ کو نویدِ بہار مل گئی

———(o)———

اس کے بعد مسرت غیبتے کی پابندیاں راستے میں حائل ہونا شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے پروگرام میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کویت کا ویزا تو آسانی مل گیا لیکن سعودی عرب میں صرف عمرہ زمینی جدہ، مکہ۔ مدینہ کا ویزا مل سکا۔ اندرونِ ملک چلنے کا نہ مل سکا۔ میں نے بہرحال اسی کو غنیمت سمجھا ——— ۱۳ اپریل کی صبح قدمِ اوّل کے طور پر جانبِ کراچی روانہ ہوا اس احساس کے ساتھ شاداں و فرحاں کہ

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم نوا خواں از سرودِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام کشاید پر بفکرِ آشیانہ

روداد کراچی

کراچی جہاز کی رسید گی اور جدّہ کے لئے دوسرے جہاز کی روانگی کے درمیان تھوڑا سا وقفہ تھا۔ میں نے کراچی کے احباب سے کہہ رکھا تھا کہ میری اس آمد کا چرچا نہ کریں۔ میں واپسی پر وہاں ٹھہروں گا تو سب سے ملوں گا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ قرآنی احباب خلوص و محبت کے گراں قدر تحائف لئے ہوٹل میں ہوٹل پہنچ کر جمع ہو گئے اور قرآنی مذاکرات کی ابتداء وہیں سے ہو گئی۔ عمر دراز خان پہلے کویت جا چکے تھے۔ میں اور محترم ظفر محمود صاحب شام کے جہاز سے جانبِ جدّہ

روانہ ہوئے۔

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس روئداد میں نہ تو اپنے تاثرات شامل کروں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تنقید و تبصرہ سے اس حکایت شیریں میں تلخی پیدا ہونے دوں گا۔ اس کے لئے اور کئی مواقع آئیں گے میں سردست اپنے آپ کو کوائف نویسی تک محدود رکھوں گا ـــــ کہوں گا تو صرف اتنا کہ میرے رفقاء جس طرح صعوباتِ سفر کے ہچکولوں کو اپنے آپ پر روکتے رہے اور ان کی جنبش تک بھی مجھ تک نہ پہنچنے دی یہ سفر اسی سے ممکن ہو سکا ـــــ فالحمد للہ علی ذلک۔

وہاں کے وقت کے قریب آٹھ بجے شب، جدہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو کویت کے قرآنی احباب۔

جدّہ

عزیزم عمر دراز خان، ان کی بیگم صاحبہ اور دونوں بچیوں کو (جو میرے لئے بمنزلہ اپنی بیٹیوں کے ہیں)۔ نیز محترم ماسٹر محمد طفیل اور شفیق صاحب۔ اور دیگر ان بزم کے میر محمد اسحٰق اور عزیزم خالد حمید کو سامنے منتظر پایا۔ سفر کی تمام کوفت مبدل بہ راحت ہو گئی۔

قرآن رشتہ بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے! رات جدّہ میں بسر کی۔ ۱۴ اپریل کی صبح قریب دس بجے، جس کعبہ کی طرف رخ کر کے تمام عمر نمازیں پڑھتے رہے، اس کی سمت عملاً گامزن ہوئے اس وقت سینہ میں جذباتِ شوق کا جو تلاطم برپا تھا، اخفا کی ہزار کوششوں کے باوجود آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسو، اس کی غمازی کر رہے تھے۔

عمر بھر مکہ اور اس کے مضافات کو، قرآن کے الفاظ میں، وادیٔ غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ وادی) لکھتا رہا لیکن اس کا مفہوم آج سمجھ میں آیا جب اس وادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ـــــ خشک پہاڑ، تپتے ہوئے صحرا، ویران دشت، بنجر زمین، بے آباد میدان ـــــ وغیرہ الفاظ اکثر بولے جاتے ہیں، لیکن جو بھیانک منظر یہاں دکھائی دیا یہ الفاظ اس کا تصور تک پیش نہیں کر سکتے۔ سیاہ بھیانک پہاڑ جن کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی زمانے میں آتش فشاں تھے۔ ان کے پتھر، پتھر نہیں بلکہ وہ ہیں جنہیں ہمارے ہاں "کھنگر" کہا جاتا ہے اور قرآن نے جنہیں حجارۃ من سجیل کہا ہے۔ سبزہ تو ایک طرف، کہیں روئیدگی تک کا نشان نہیں۔ ان سے نیچے اتریئے تو ایسا ریگستان جس سے (اس وقت معتدل موسم میں بھی) لو کے شعلے ابھرتے تھے۔ کہیں پانی کا قطرہ تک نہیں۔ زندگی کا سراغ تک نہیں۔ یہ تھا جدّہ سے مکہ تک کا راستہ جسے ہم طے کر رہے تھے۔ یہ تو حرم پاک کی مقناطیسی کشش ہے جو این و آں سے بے گانہ کشاں کشاں جانبِ منزل لئے جاتی ہے، ورنہ وحشت و دہشت کے اس مسلسل منظر سے انسان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔

ایک بجے کے قریب ہم بیت اللہ کے بابِ عالی کے سامنے تھے۔ لیکن قبل اس کے ہم بحضور کعبہ حاضر ہوں، جی چاہتا ہے کہ میں ان خیالات کو قلم بند کر دوں جو عظمتوں اور رفعتوں کی اس آماجگاہ کے ماحول کے متعلق میرے دل میں ابھرے تھے۔ حرم پاک، سازی دنیا میں منفرد مقام ہے۔ اس کی انفرادیت اہمیت اور شرف و مجد کا تقاضا ہے کہ جونہی ہم جوارِ مکہ میں داخل ہوں، ہماری عقیدتوں کا یہ مرکز ابھر کر

ہمارے سامنے آکر باعثِ فروغِ دیدہ اور وجۂ تسکینِ قلب ہو اور جوں جوں ہم اس کی طرف بڑھتے جائیں، شادابیاں اور نکہت پاشیاں فرشِ راہ بنتی جائیں۔ یعنی اس کی (APPROACH) ایسی ہو کہ اس پر ہزار بہاریں نثار ہوں۔ لیکن مضافِ کعبہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کعبہ کے فطری محل وقوع کے متعلق یوں سمجھئے گویا ایک بہت بڑا پیالہ ہے جس کے پیندے میں حباب آسا ایک عمارت ہے۔ مکہ کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اور ان کے اندر نشیب میں خانہ کعبہ ہے۔ اس کے اس محل وقوع کا بدل دینا تو ممکن نہ تھا لیکن اس کے بعد انسانی ہاتھوں نے جو کچھ کیا ہے اسے توڑا جا سکتا تھا۔

حریم کعبہ بے شک ایک عظیم عمارت ہے لیکن اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ شاہراہیں ہیں جن پر ہر وقت ٹریفک کا سیلاب رواں دواں رہتا ہے۔ ان شاہراہوں سے ملحق ہر طرف سربفلک عمارتیں ہیں اور یہ سلسلہ پورے حدودِ مکہ تک پھیلا ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حرم کعبہ ان عمارات کی بلندیوں تلے دب کر رہ گیا ہے۔ بس یوں سمجھئے گویا (لاہور کے) اندرونِ شہر، محلہ کی کوئی مسجد ہو کہ جب تک آپ اس کے دروازے میں داخل نہ ہوں، اس کے عدم و وجود کا پتہ نہ چلے۔ ایسا ہی ماحول مسجد نبویؐ کا ہے! دل انہیں بلند و بالا دیکھنا چاہتا تھا۔

—(٠)—

طوافِ کعبہ

اب ہمت کر کے آگے بڑھیئے۔ ہم نے احرام جدہ سے باندھ لیا تھا۔ سب سے پہلے عمرہ کے مناسک ادا کرنے ضروری تھے اور ان میں سرِ فہرست طوافِ کعبہ تھا۔ وسیع و عریض صحنِ کعبہ مسقف نہیں اس لئے اس وقت وہاں تپش کافی تھی۔ لیکن طائفین کا جذب و کیف اس سے کب متاثر ہوتا ہے۔ وہ انتہائی محویت کے عالم میں، سرفروشانہ انداز سے، مصروفِ طواف تھے۔ ہمارے کارواں کی جوئے کم آب بھی اس بحرِ بے کنار میں جذب ہو گئی۔ اس بے خودی کے عالم میں میرے لب پر قرآنی دعائیں تھیں۔ میں سبقت کرتا تھا اور میرے ہم نوا احباب انہیں اسی ذوق و شوق سے دہراتے جاتے تھے ——

دل سوز سے لبریز۔ لب پہ یہ پرکیف صدائیں۔ آنکھیں نمزمہ بار۔

دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ میرے مضمحل اعصاب شاید اس تپش کو برداشت نہ کر سکیں۔ لیکن حسنِ اتفاق کہ عین اس وقت صحنِ حرم پر بادل سایہ فگن ہو گئے اور ہلکا سا ترشح بھی ہوا جس سے موسم خاصا معتدل ہو گیا۔ میرا سرِ نیاز بے ساختہ بدرگاہِ رب ذوالمنن جھک گیا۔

اتنے میں کبوترانِ بامِ حرم کا ایک جھرمٹ صحنِ کعبہ میں اتر آیا جسے دیکھ کر اقبالؒ کی وہ دعا لب پر آ گئی جو انہوں نے آتشِ مسکر کے ضعف و ناتوانی کو سامنے رکھ کر مانگی تھی کہ ؎

بہ جلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی

کعبہ کے دروازہ کے سامنے آیا تو یوں سمجھئے کہ جھولی پھیلا کر مبداءِ جود و سخا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ

خواجہ من نگاہ دار آبروئے گدائے خویش — آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نہ کند پیالہ را

خانہ خدا کا دروازہ خالص سونے سے منڈھا ہوا ہے جس کے نیچے، سونے ہی کی جلی حروف میں جلالت الملک (شاہ) خالد ابن سعود لکھا ہے (بعد کے الفاظ اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں)۔

گراں بہا سنگِ مرمر کے اس انبار اور زرِ خالص کے اس سیلاب میں، گداگروں کے پھیلائے ہوئے ہاتھ، عجیب تضاد پیدا کر رہے تھے۔ لیکن میں نے تو خاموش رہنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس لئے۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم — فروغِ تجلی بسوزد پرم

(۰)

سعی

سعی بین الصفا والمروہ کا مرحلہ خاصا مشقت طلب نظر آیا۔ اگرچہ وہاں اب نہ وہ پہاڑیاں ہیں اور نہ ہی وہ ریگ زار۔ اسے مسقف بھی کر دیا گیا ہے اور خنک بھی۔ لیکن زیادہ چلنے سے میرے پاؤں میں جو لغزش پیدا ہو جاتی ہے اس سے اس سعی کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ لیکن مجھ جیسے مریضوں کے لئے وہاں پہیئے دار کرسیوں کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ جواں سال و جواں بخت عزیزم خالد کی قوتِ بازو نے یہ مرحلہ آسان کر دیا۔

ظہر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کرنے کے بعد اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ یہ ہوٹل، حریم کعبہ کے سامنے تھا لیکن وہ بلند و بالا عمارات جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے، مستقل حجاب بن کر حائل تھیں۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں بھی وہیں جا کر پڑھیں۔ بجلی کی روشنی کے سیلاب میں اس کی جگمگاہٹ کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ لیکن میری نگاہیں کچھ اور دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ کسی نے شاید میرے قلبِ مضطر کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آ چکے ہیں، مگر انتظار باقی ہے۔

(۰)

۱۵ اپریل

صبح دس بجے کے قریب میدانِ عرفات دیکھنے کے لئے گئے۔ حج اسی مقام پر ہوتا ہے۔ ایک لق و دق، بے برگ و گیاہ میدان جس کے ایک جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر (جسے جبلِ رحمت کہتے ہیں)۔ ایک (سفید) سا نشان ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے حجۃ الوداع کا خطبہ وہاں سے نشر فرمایا تھا ــــــ وہ خطبہ جلیلہ جو نوعِ انسان کی آزادی کا عالمگیر منشور ہے۔ حضورؐ کے عہدِ ہمایوں

میدانِ عرفات

میں عرفات کے میدان میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا اجتماع ہوا تھا لیکن نگاہِ نبوی کس قدر دور رس تھی کہ اس کے لئے ایسے میدان کا انتخاب کیا گیا کہ آج بیس لاکھ کا جمِ غفیر بھی اس کے ایک گوشے میں سما جائے۔

نظامِ خداوندی کی یہی وہ نشرگاہ ہے جہاں سے ایک دن پھر اس انقلابِ عظیم کی آواز بلند ہونی ہے

جس نے نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائی ہے۔ کس قدر بلند و بالا ہے مرتبہ اس چھوٹی سی پہاڑی کا!

پروگرام طائف جانے کا بھی تھا۔ لیکن ایک ناگہانی حادثہ کی وجہ سے وہاں نہ جا سکے۔

(٠)

۱۶ / اپریل

شام کو منیٰ گئے اور وہاں جو کچھ دیکھا اسے بیان کرنے کے لئے بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ —— ہوش میں آؤں تو کہوں! یہ وہ مقام ہے جہاں قربانی کے جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ پہلے ان لاکھوں جانوروں کو ذبح کرنے کے بعد گڑھوں میں دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ زمین ان کی متحمل نہ ہو سکی۔

منیٰ کی بھٹیاں

اب وہاں مہیب بھٹیاں نصب ہیں۔ ان ذبح شدہ جانوروں کو ان بھٹیوں میں ڈال کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے۔ میں ان بھٹیوں کو دیکھ رہا تھا اور نوائے سروش یہ سرگوشی کر رہی تھی کہ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ، منہ سے کچھ نہ کہہ!

آگے بڑھے تو ان تین "شیطانوں" سے ملاقات ہوئی جو لاکھوں حاجیوں کے کروڑوں سنگ ریزوں کا ہر سال ہدف بنتے ہیں لیکن ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ پہلے یہ کھلے آسمان کے نیچے ایستادہ تھے لیکن اب ازدحام کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے اس ابلیس گاہ کو دو منزلہ بنا دیا گیا ہے اور اسی ضرورت کے تحت ان (شیاطین) کو زیادہ قد آور کر دیا گیا ہے، حالانکہ اقبالؒ کے قول کے مطابق تو شیطان نے مدت ہوئی یہ کہہ کر بارگاہِ رب العزت اپنی ریٹائرمنٹ کے لئے درخواست گذران دی تھی کہ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست — باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک (بالِ جبریل)

۱۷ / اپریل

صبح کی نماز مسجد الحرام میں بالخصوص اس مقصد کے لئے ادا کی کہ نور کے تڑکے، اس کی ایمان افروز اور سکون افزا فضا سے قلب و نگاہ کو سیراب کروں لیکن بجلیوں کی خیرگی نے اس مسحور کن فضا کو بازیاب نہ ہونے دیا۔ اے کاش! کوئی اس فضا کی نورانیت کو سمجھ سکتا اور فجر سے پہلے اس مصنوعی روشنی کی جگہ فطرت کے چھنتے نور کو اذنِ آئینہ پاشی دیتا!

(٠)

رہ بطحا گرفتم

مکہ میں مناسکِ عمرہ ادا کرنے، اور ان مقامات کی زیارت کرنے کے بعد جن تک موجودہ پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے رسائی ممکن تھی دیارِ حبیبؐ سے تطہیرِ قلب و نگاہ کی آرزو شدت اختیار کر رہی تھی۔

چنانچہ ۲۷ اپریل ہی کی سہ پہر ہمارا کاروانِ شوق جانبِ بطحا جادہ پیما ہو گیا۔ حوالیٔ مکہ سے باہر نکلتے ہی وہ پہاڑی نظر آئی جس پر غارِ حرا واقع ہے۔ پہاڑی خاصی اونچی ہے اور غار تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہیں بنایا گیا۔ اس لئے اس تک پہنچا نہ گیا۔ اور ہم آگے روانہ ہو گئے۔

جو کچھ انسانی ہاتھوں نے بنایا ہے، اسے چھوڑ کر، مکہ سے مدینہ تک (قریب تین سو میل) کا راستہ اسی قسم کے پہاڑوں، صحراؤں۔ بے برگ و گیاہ میدانوں۔ بیابانوں اور ویرانوں پر مشتمل ہے جن کا میں نے جدہ سے مکہ تک کے راستے کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ البتہ اس راستے میں کہیں کہیں بہتا پانی نظر آیا جس کے متعلق بتایا گیا کہ حال ہی میں بارش ہوئی ہے۔ کہیں کہیں سبزہ بھی دکھائی دیا۔ لیکن یہ سب ویرانیاں خارجی ماحول سے متعلق تھیں۔ ہماری داخلی دنیا میں وفورِ شوق سے جو جنتیں ابھر رہی تھیں ان کی نکہت پاشیوں نے اس ماحول کو نگاہوں سے یکسر اوجھل کر رکھا تھا۔ اور اس کی جگہ کچھ اور ہی نگاہ کے سامنے تھا۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبحِ خند است ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ شبش کوتاہ و روزش او بلند است

قدم اے راہرو! آہستہ تر نہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ چو ما ہر ذرہ او دردمند است! ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ (ارمغانِ حجاز)

مسافت کٹتی جا رہی تھی اور میں اس قسم کے خیالات میں مستغرق تھا کہ آج اس راستے میں ہموار پختہ سڑک ہے۔ کہیں کہیں آبادیاں بھی ہیں۔ منزلیں بھی ہیں جہاں سامانِ خورد و نوش بھی میسر ہے۔ نہ رہزنوں قزاقوں کا ڈر ہے نہ درندوں کا خوف۔ لیکن وہ کیا کشش تھی جو آج سے چودہ سو سال پہلے، مہاجرین السابقون کے بے خانماں و بے سامان قافلوں کو ان وحشت زا اور دہشت خیز ریگستانوں اور ویرانوں میں رواں دواں لئے چلی آتی تھی، کشش ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کی۔ قوت ایک مستحکم ایمان کی!

شہدائے بدر کے مزار

ذرا آگے بڑھے تو کسی نے یہ نشیدِ جانفزا سنائی کہ یہاں شہدائے بدر کے مزار ہیں۔ سوچیئے کہ اس کے بعد کس کا قدم آگے اٹھ سکتا تھا، لیکن وہاں جا کر جو کچھ دیکھا اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

ایک چار دیواری کے اندر بے ہنگم بکھرے ہوئے پتھر۔ نہ کوئی مزار۔ نہ کسی مزار کی تختی!

(٠)

آگے بڑھے تو دیارِ حبیبؐ کی روشن شمعیں وجہ افروغِ دیدہ ہو رہی تھیں۔ دل تڑپ تڑپ اٹھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وفورِ جذبات سے مجھ پر کیا گزرتی اگر میرا شعور میری یاوری نہ کرتا اور مجھے چودہ سو سال پیچھے لے جا کر اس فردوس آفریں منظر کو سامنے نہ لے آتا جب حضور نبی اکرمؐ ہجرت کے وقت قریبِ مدینہ میں جمال افروز ہوئے تھے اور مدینہ کے سعادت مند انصارؓ نے والہانہ انداز سے حضورؐ کا استقبال کیا تھا۔ چالیس سال پہلے میں نے اس منظرِ جانفزا کو ان الفاظ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی،

ہجرتِ نبویؐ

"اس طرح رواں دواں، نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے یہ قافلہ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا۔ اور ۸ ربیع الاوّل (۲۳ ستمبر) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی ہیں۔ اس نے آواز دی کہ "اہلِ عرب! لو جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آگیا" تمام شہر اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا اور انصار ہتھیار سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے اور پروانہ وار اس آواز کی سمت بڑھے۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے۔ اس بستی کو قباءؔ کہتے ہیں۔ حضورؐ یہاں پہنچے تو تمام افرادِ خاندان نے جوشِ مسرت میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے۔ ان کے مقدر نے یاوری کی اور حضورؐ نے ان کی میزبانی قبول فرمائی۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا اس لئے کہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہوتی ہی مسجد ہے۔ یہ مسجدِ قباءؔ تھی۔

چودہ (۱۴) دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ یہ اس سرزمین میں جسے حکومتِ خداوندی کا گہوارہ بننا تھا، جماعتِ مومنین کا پہلا اجتماع تھا۔ کس قدر حسین تھی یہ ابتداء! قباءؔ سے مدینہ تک راستہ میں دو رویہ فدائیوں کی صفیں تھیں۔ سارا شہر جوشِ مسرت اور فرطِ عقیدت سے معمورۂ جذب و نشاط اور گہوارۂ حسن و بہار بن رہا تھا۔ گلی کوچوں سے خدا کی حمد و ستائش کے نغمے اور تشکر و امتنان کے زمزمے ساری فضا کو کیف بار اور مسرت ریز بنا رہے تھے۔ جوشِ استقبال سے قلوب کے ساغر اس طرح بے محابا چھلک رہے تھے کہ صہبائے محبت، مسرت و ابتہاج کے نورانی آنسوؤں کی شکل میں دامان و آستین کو صحنِ گلستاں و کفِ باغباں بنا رہی تھی۔ کہیں جبینِ نیاز بحضورِ ربِ ذوالمنن سجدہ ریز و زمین بوس تھیں اور کہیں ہجومِ جذبات سے مرتعش ہاتھ تھے کہ بارگاہِ صمدیت میں اس مہمانِ عزیز کی خیر سگالی اور خوش بختی کی حسین دعائیں اور معصوم التجائیں لئے ہوئے یوں جانبِ عرشِ عظیم اٹھ رہے تھے جیسے خاموش صحرا میں نخیلِ بلند ایستادہ۔ خاکِ یثرب کے ذرات ابھر ابھر کر ہمہ تن دیدہ بن رہے تھے کہ آج انہیں اس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہونے والی تھی جو تمام عالم کے لئے سرمایۂ فخر و ناز تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا   مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا   مَا دَعَیٰ لِلّٰہِ دَاعِ

خلوص و محبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن دخولِ یثرب کی وادی میں داخل ہوا جس کا نام اس کے بعد "مدینۃ النبی" ہوگیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضورؐ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوبؓ انصاری کے مقدر میں تھا جہاں اب مسجدِ نبویؐ ہے۔ حضرت ایوبؓ کا مکان اس سے متصل تھا۔ حضورؐ وہیں فروکش ہو گئے۔" (معراجِ انسانیت۔ صـ ۲۲۳)

رات کے قریب دو بجے، جوارِ مدینہ میں داخل ہوئے تو بے ساختہ میری زبان پر تھا:

پایم بہ پیش از سرایں کو نمی رود ! یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست؟

اور رفقائے سفر سے اتنا کہہ سکا کہ

بیا اے ہم نفس! باہم بنالیم من و تو کشتۂ شانِ جمالیم

دو حرفے برمرادِ دل بگوئیم ! بپائے خواجہ چشماں را بمالیم (ارمغانِ حجاز)

قلبی کشش بے پناہ تھی لیکن میری حالت کو دیکھتے ہوئے احباب نے یہی مناسب سمجھا کہ میں اس وقت روضۂ اطہر کی جاروب کشی کے لئے نہ جاؤں۔ اس میں شبہ نہیں اس سفر کو میرے لئے پُر آسائش بنانے کے لئے تمام احباب نے اپنی اپنی جگہ بڑی دلدہی سے کام لیا لیکن اخی مکرم میاں ظفر محمود کی نگاہ ہمیشہ میرے دل پر رہتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ مجھے نازک اور مشکل مقامات پر نہ تھامتے تو معلوم میں کس وقت ڈھیر ہو کر رہ جاتا۔ میں ان کی اس عناں گیری کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں؟

اور ۱۸ اپریل کی صبح دس بجے میں (رفقاء کی معیت میں) مسجدِ نبویؐ میں گنبدِ خضریٰ کے سامنے سرنگوں کھڑا تھا!

کہاں میں! کہاں یہ مقام!! اللہ! اللہ۔

میں آنکھیں بند کئے کھڑا تھا کہ یکایک علامہ اقبالؒ عالمِ تصور میں سامنے آگئے۔ وہ ساری عمر دیارِ نبویؐ کی خاک بوسی کی آرزو کو حرزِ جاں بنائے رہے۔ جنوری ۱۹۳۸ء کی آخری ملاقات کا وہ جگر پاش منظر مجھے کبھی نہیں بھولتا جب علامہ اسلم جیراجپوری نے ان سے کہا کہ آپ کا حجازِ مقدس جانے کا ارادہ تھا! فرمایا کہ عالمِ تصور میں تو میں دن رات انہی راستوں میں رہتا ہوں لیکن اس بیماری میں یہ آرزو برآتی نظر نہیں آتی۔ یہ کہا اور ان پر غشی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ دورہ اس قدر جانکاہ تھا کہ (سید نذیر نیازی مرحوم کے ایما پر) یہی مناسب سمجھا کہ محفل برخواست کر دی جائے۔ میں سوچتا تھا کہ حضرت علامہؒ اس آرزو کو دل میں لئے عالمِ جاوداں کی طرف تشریف لے گئے اور میں کس قدر خوش بخت ہوں کہ میری آرزو یوں پوری ہو رہی ہے۔ میں دل ہی دل میں یہ باتیں کر رہا تھا اور بارگاہِ رسالتمآبؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے علامہؒ ہی کے یہ اشعار میری زبان پر تھے کہ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند آسماں از بوسۂ بامت بلند

از تو بالا پایۂ ایں کائنات فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

در جہاں شمعِ حیات افروختی ! بندگاں را خواجگی آموختی ! (مثنوی رموزِ اسرار)

پھر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو ملتِ اسلامیہ کا درد سینے میں اُمنڈ آیا اور عرض کرنے کی جرأت کی کہ

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است ہنوز ایں کارواں دور از مقام است

زکارِ بے نظامِ او چہ گویم ! تو می دانی کہ ملت بے امام است ! (ارمغانِ حجاز)

اور کبھی یہ کہ

نگہبانِ حرم معمارِ دَیر است — یقینش مُردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او چہ گویم ! — کہ نومید از ہمہ اسبابِ خیر است (ارمغانِ حجاز)

التزام یہ رکھا کہ نماز میں امام کے قریب تر جگہ مل جائے کہ حضورؐ جس محراب میں جلوہ افروز ہوا کرتے تھے وہ اس کے قریب ہی تھا۔ اس سے عالمِ تصور میں قلبی تسکین کا سامان فراہم کر دیا تھا۔

کسی نے مکہ اور مدینہ کے لئے جن تعظیمی الفاظ کا لاحقہ تجویز کیا تھا وہ معنویت کے اعتبار سے بڑا بلیغ تھا۔ یعنی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ۔ مکہ کی عظمت سے ذہن متاثر ہوتا ہے اور مدینہ کی نورانیت سے قلب رشکِ طور۔

---(۰)---

۱۹؍ اپریل

مسجدِ قبا

مختلف تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے نکلے۔ سب سے پہلے مسجدِ قبا کو دیکھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یہ سب سے پہلی مسجد تھی جسے حضورؐ نبی اکرم نے ہجرت کے بعد مدینہ سے باہر تعمیر فرمایا تھا۔ چنانچہ اس کے دروازے پر خدا کی یہ شہادت کندہ ہے: لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ ..... ٥ (۹/۱۰۸) لیکن موجودہ مسجد کا صرف محلِ وقوع وہی ہے۔ مسجد حال ہی کی تعمیر کردہ ہے۔ یہی کیفیت ہر تاریخی مقدس مقام کی ہے۔

اس کے بعد جنگِ اُحد کے میدان کو دیکھا۔ وہاں بھی پہاڑ تو وہی ہے لیکن اس کے دامن میں ماڈرن بنگلے اور کوٹھیاں آباد ہیں۔ شہداء کے مزارات کا بھی کوئی نشان نہیں۔ لوہے کے ایک جنگلے کے اندر چند پتھر رکھے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت حمزہؓ کی جائے شہادت (یا مزار) کا نشان ہے۔ وہاں ان معلومات کے حاصل کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں۔

اس سے ذرا آگے "بئرِ عثمانؓ" (حضرت عثمانؓ کا کنوآں) ہے۔ یعنی وہ کنوآں جسے حضرت عثمانؓ نے ایک یہودی سے خرید کر اہلِ مدینہ کی ضروریات کے لئے وقف کر دیا تھا۔ یہ کنوآں، اس کی کہنگی اور خستگی کے پیشِ نظر، شاید اپنی اصلی حالت میں ہو۔ لیکن اس کی غلاظت، چمگادڑیں اور بلیوں کے بچے، ہماری بے حسی کے نوحہ خواں ہیں۔

ازاں بعد "مسجد ذو قبلتین" دیکھنے گئے۔ اس مسجد کی داستان دلچسپ بھی ہے اور تاسف انگیز بھی۔ روایات کی رُو سے (جو بالبداہت وضعی اور یہودی سازش کا نتیجہ نظر آتی ہیں) کہا یہ جاتا ہے کہ

۱۔ بعض روایات میں ہے کہ اس آیت میں اشارہ مسجدِ نبویؐ کی طرف ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پہلی مسجد قبا میں تعمیر ہوئی تھی۔

مسجدِ ذو قبلتین

مکہ کی تیرہ سالہ (نبوّت کی) زندگی میں حضورؐ، بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے اگرچہ چاہتے تھے کہ رخ کعبہ کی طرف کیا جائے۔ اس کے لئے آپؐ نے شکل یہ اختیار کی کہ حرم کعبہ میں نماز کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی، کیونکہ یہ دونوں ایک سیدھ میں پڑتے تھے۔ جب حضورؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہ انداز نباہنا مشکل ہوگیا اس لئے کہ اب بیت المقدس (یروشلم) اور کعبہ (مکہ) دو مخالف سمتوں میں پڑتے تھے۔ اگر منہ بیت المقدس کی طرف کرتے تو کعبہ کی طرف پشت ہو جاتی اور کعبہ کی طرف رخ کرتے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو جاتی۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ آپؐ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے۔ پڑھنے کو تو آپؐ اس طرح نماز پڑھتے، لیکن آپؐ دل سے اُسے پسند نہ فرماتے۔ قریب سترہ ماہ (اور بعض روایات کی رُو سے، قریب دو سال تک) آپؐ اسی نہج سے نماز ادا فرماتے رہے، تاآنکہ ایک دن جب آپؐ، ایک غیر معروف سی مسجد میں، ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے، عین حالتِ نماز میں خدا کی طرف سے حکم آیا کہ آپؐ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھا کریں۔ حکم آنے پر آپؐ نے،.... (باقی نماز کے لئے) اپنا رُخ بدلا اور آپؐ کے ساتھ مقتدیوں نے بھی رُخ بدلنے کا نقشہ اس طرح ذہن میں لائیے کہ اگر پہلے منہ مغرب کی طرف تھا تو اب مشرق کی طرف کرنا پڑا۔ مقتدیوں نے تو رخ کھڑے کھڑے بدل لیا ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ امام (حضورؐ) کو مسجد کا نصف چکّر کاٹ کر، دوسری جانب امامت کے لئے جانا پڑا ہوگا۔ جس مسجد میں (روایات کی رُو سے) یہ واقعہ پیش آیا اُسے مسجدِ ذو قبلتین کہتے ہیں۔ (یعنی دو قبلوں والی مسجد) اس سے پہلے، اس مسجد کی بالمقابل دیواروں میں دو محراب تھے —— ایک کا رُخ جانب بیت المقدس تھا اور دوسرے کا جانبِ کعبہ —— نماز تو اُسی محراب میں کھڑے ہوکر پڑھائی جاتی تھی جس کا رخ جانبِ کعبہ تھا لیکن مقابل کا محراب بطور یادگار قائم رکھا تھا۔ اب اس دوسرے محراب کی جگہ دیوار پر نشان سا دے دیا گیا ہے لیکن مسجد کو ذو قبلتین ہی کہا جاتا ہے۔ (میں نے اس کی تفصیل اپنی کتاب "مطالب الفرقان" جلد سوم۔ صفحہ ۸۲، میں لکھی ہے جس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ روایات کس طرح یہودیوں کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ حیرت ہے کہ (علاوہ دیگر دلائل و شواہد) اتنی سی بات بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ حضورؐ نبی اکرمؐ نے مدینہ میں سب سے پہلے مسجدِ قبا تعمیر فرمائی اور اس کے تھوڑے دنوں بعد مسجدِ نبویؐ۔ ان دونوں مسجدوں کا رُخ کعبہ کی جانب ہے۔ اگر حضورؐ مدینہ میں ہجرت کے بعد سترہ ماہ یا دو سال تک بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز ادا فرماتے رہے تھے تو ان مسجدوں کا محرابِ اوّل، جانب بیت المقدس ہونا چاہیئے تھا اور دوسرا محراب کعبہ کی سمت۔ لیکن ان مسجدوں میں ایک ہی محراب ہے اور وہ جانبِ کعبہ ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ حضورؐ ہجرت کے بعد، یومِ اوّل ہی سے، کعبہ کی سمت رُخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایسی محسوس اور واضح شہادت ہے کہ اس کے بعد اس غیر معروف سی مسجد میں، حالتِ نماز میں تحویلِ قبلہ کا واقعہ بالکل بے سند رہ جاتا ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ چودہ سو سال سے (یا جب سے یہ روایات وضع ہوکر کتبِ احادیث میں راہ پا گئیں) اس مسجد کو

"ذو قبلتین" پکارے جا رہے ہیں اور تحویلِ قبلہ کے اس (وضعی) واقعہ کو مستند تسلیم کئے جا رہے ہے ....! ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی سند وہ روایات ہیں جنہیں وضعی کہنے کی کسی کو جرأت نہیں۔

ان مقامات کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن سب سے زیادہ کشش جنت البقیع کی تھی۔ وہ عہدِ رسالت مآبؐ اور صحابہ کرامؓ کا مدینہ کا سب سے بڑا قبرستان تھا جس میں ازواجِ مطہراتؓ ——

جنّتُ البقیع

جلیل القدر صحابہؓ، عظیم المرتبت ائمہؒ وغیرہ محوِ خواب ہیں۔ ان کے مزارات کے ساتھ صدرِ اوّل کی ساری تاریخ وابستہ ہے اس لئے اس کی اہمیت واضح ہے۔ شام کے قریب کشاں کشاں وہاں گئے اور جس وفورِ عقیدت و احترام سے گئے تھے اس سے ہزار گنا زیادہ تاسف ہی نہیں، صدمہ کے ساتھ واپس لوٹے۔ لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے اندر ویران پتھروں کا میدان ہے جس میں کوئی مزار تو ایک طرف، کسی مزار کی تختی تک نہیں۔ نہ ہی دروازے کے باہر ان حضرات کے اسماءِ گرامی کی کوئی فہرست ہے جن کے مزارات کے نشان تک باقی نہیں۔

میرا مرض، پریشانی، غم اور صدمات سے بڑھ جاتا ہے۔ اتنے دنوں چلتا پھرتا رہا لیکن یہاں پہنچ کر کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ چلنا تو ایک طرف، کھڑے رہنا بھی دشوار ہو گیا۔ احباب بمشکل مسجدِ نبویؐ تک لے کر آئے۔

——(ہ)——

دہران کے احباب نے بڑی کوشش کی کہ وہاں جانے کی اجازت مل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہاں کے قرآنی احباب کا ٹیلی فون پر ٹیلی فون آتا تھا کہ دہران آنے کا کوئی انتظام کیا جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور انہیں (اور ان کے ساتھ مجھے بھی) بڑی مایوسی ہوئی۔ اسی طرح ریاض کے احباب کو بھی۔ ۲۰ راپریل کی صبح، عزیزم خالد حمید واپس دہران چلے گئے۔ (زہیر اسحٰق صاحب ایک دن کے لئے رک گئے) اور کویت کے احباب بھی واپس روانہ ہو گئے۔ آخری دنوں حسنِ اتفاق سے، چوہدری محمد رمضان صاحب کی احبابِ کویت سے ملاقات ہو گئی۔ یہ کبھی وہاں ہوتے تھے۔ آجکل جدہ میں ہیں۔ بیوی بچوں سمیت، مختصر سے قیام کے لئے مدینہ آئے تھے۔ بڑے خلوص اور محبت کے پیکر۔ اگرچہ وہ بھی ہماری طرح مدینہ میں اجنبی تھے لیکن انہوں نے مجھ مریض کے آرام اور آسائش کے لئے اتنا کچھ کیا جو یکسر غیر متوقع تھا۔ یہاں سے روانہ ہو گئے تو جدہ کی شب بھی انہی میزبانی کا حق ادا کیا۔ قرآن کا رشتہ بھی کس قدر پُرخلوص اور گہرا ہوتا ہے۔

۲۱ راپریل

آج اس رحمتوں کے سرچشمہ میں (جسے اقبالؒ نے —— اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است —— کہہ کر پکارا تھا) قیام کا آخری دن تھا اور اس احساس سے دل بوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے اس شہر کی

گلیوں کی حرمت اور تقدّس کے متعلق قریب چالیس سال پہلے جو کچھ کہا تھا، اس کی یاد ذہن میں تازہ ہو رہی تھی۔

ہوا یوں کہ امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضورؐ ختمی مرتبت (علیہ الصّلوٰۃ والسلام) کی شانِ اقدس و اعظم میں کچھ نازیبا الفاظ کہے۔ جس کے خلاف، سر عبدالحلیم غزنوی (مرحوم) نے اسمبلی میں التوا کی تحریک پیش کی۔ لیکن حکومت نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اس پر میں نے، قلمِ خونچکاں سے لکھا کہ

مدینہ کی گلیاں

دنیا کو شاید ابھی معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک، جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے، حضورؐ سرورِ دو عالم کی قدر و منزلت کیا ہے۔ وہ ذاتِ گرامیؐ (فداہ ابی و امی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی اور متاعِ حیات ہے، ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم، اور دنیا کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا، ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔ خوش بخت ہیں وہ راہیں جن میں وہ شمعِ فروزاں، ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی، اور زہے نصیب خاک کے ان ذرّوں کے جو ان درخشندہ و تابناک نقوشِ قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیتؐ کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا، ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شاہنشاہِ کونینؐ کی ناموس پر نچھاور ہو جائے، تو بھی دل کی تمنا پوری نہ ہو۔ جس سینے میں عشقِ رسولؐ کا سوز نہیں، سینہ نہیں، بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمدؐ پر مر مٹنے کی تمنا نہیں، دل نہیں، بوم و کرگس کا وحشت انگیز نشیمن ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۱ء۔ ص ۵۱-۵۲)

آج ان گلیوں کو الوداعی سلام کہنے کا وقت آ گیا۔ عصر کی نماز، امام کے عین پیچھے ادا کی۔ پھر بارگاہِ رسالتمآبؐ میں آخری حاضری کے لئے جو کھڑا ہوا ہوں تو کچھ یاد نہیں پڑتا کہ دل کی کیا حالت تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ

الوداع

دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار ۔۔۔ اس محویت میں بھی اقبالؒ کی وہ دعا بے ساختہ زبان پر آ گئی جسے میں برسوں سے دہراتا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں کہ

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
عرض کن پیشِ خدائے عزّوجل | عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا | آبِ بیسا نم گہر گرداں مرا

ان آرزوؤں اور تمناؤں کے اظہار کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔

رات ۸ بجے کے جہاز سے روانہ ہو کر، ۹ بجے کے قریب جدّہ آگئے۔ میر محمد اسحٰق اور چوہدری محمد رمضان صاحب کے حسنِ انتظام کے تصدّق، رات، الواحا ہوٹل میں بڑے آرام سے بسر کی۔ ۲۲ اپریل، بارہ بجے کے جہاز سے روانہ ہو کر، چار بجے کے قریب کویت پہنچ گئے۔ جہاں قرآنی احباب ایئرپورٹ پر موجود تھے۔

(۰)

لیکن قبل اس کے کہ میں کویت کی روئداد پیش کروں، سفرِ حجاز کا ایک قرض میرے ذمے ہے جس کا اتارنا ضروری ہے۔ میں قدم قدم پر یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ وہاں، میری آنکھیں جو کچھ دیکھنے کو ترستی تھیں، ترستی رہ گئیں۔ وہ کیا تھا جسے دیکھنے کے لئے وہ ترستی رہ گئیں؟

اس میں شبہ نہیں کہ جب مسلمان عازمِ حجاز ہوتا ہے تو اس کا اوّلین مقصد، حج یا عمرہ کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ آرزو بھی موجزن ہوتی ہے کہ ان شہروں کو دیکھیں جن میں حضورؐ اور صحابہ کبارؓ بستے تھے۔ ان مکانوں کو دیکھیں جن میں وہ فروکش تھے۔ مکہ اور مدینہ کی

ترستی ہوئی آنکھیں

کی ان گلیوں اور راستوں کو دیکھیں جن پر ان کے نقوشِ پا ثبت ہوئے تھے۔ ان میدانوں کو دیکھیں جن میں عالمگیر انقلاب کی جنگیں لڑی گئی تھیں۔ اس زمانے کی تہذیب و تمدّن کے آثار کو دیکھیں۔ ان کے اندازِ بود و ماند کا مشاہدہ کریں۔ ان مساجد کو دیکھیں جن سے لا الٰہ الا اللہ کا باطل شکن نعرہ سب سے پہلے بلند ہوا تھا اور جو محمدؐ رسول اللہ کی رسالت کی اوّلین شہادت گاہ بنی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے کی آرزو دل میں لے کر مسلمان وہاں جاتا ہے۔ لیکن اسے وہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ، تعمیر و تحسین اور جلال و جمال کے اعتبار سے مکہ اور مدینہ کا شمار دنیا کے عظیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ وہاں کی سربفلک عمارات، نیویارک اور واشنگٹن کو مات کرتی ہیں۔ وہاں کی مساجد، ماڈرن طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ حرمِ کعبہ اور مسجدِ نبویؐ کی آرائش و زیبائش پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہیں (اور ہو رہے ہیں) لیکن مسلمان تو ان مٹی کے مکانوں اور کھجور کے پتوں سے مشقف مسجدوں کو دیکھنے کی آرزو لے کر جاتا ہے جن کے ذرّے ذرّے سے اسے عشق ہے۔ ان یادگاروں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے سے انسان کے دل پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جو قومیں اس کی اہمیت کو جانتی ہیں، وہ اپنے آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ دُور کیوں جائیے۔ ہم موہن جوڈارو کے کھنڈرات کی حفاظت کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ (اور دنیا کی دیگر اقوام بھی اس میں ممدّ و معاون ہوتی ہیں) حالانکہ موہن جوڈارو کا ہم سے اتنا ہی تعلق ہے کہ تقسیمِ ہند کی لکیر کھینچتے

وقت، وہ ہماری طرف آگیا۔ ارضِ حجاز کے ان مقدس آثار میں سے کچھ بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھے جاتے تو اس سرزمین کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی۔ میں اس تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا کہ وہاں کوئی دیوار تک بھی ایسی نظر آجائے جو اسلام کے صدرِ اوّل کی یادگار ہو۔ ایک دن کسی نے کہا کہ فلاں مقام پر وہ مکان ہے جس میں حضور رحمتِ دوعالم کی ولادت ہوئی تھی۔ دواں دواں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک لائبریری ہے۔ یعنی اس مکان کی جگہ ایک جدید عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں لائبریری قائم ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ اب اس نوحہ خوانی سے کچھ حاصل نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ آثار تو ایک طرف، وہاں ان کی نشاندہی کے لئے تختیاں تک بھی نہیں۔ اس نقصان کا اب ازالہ ہو بھی نہیں سکتا۔ جو آثار معدوم ہو چکے ہوں، وہ واپس کیسے آسکتے ہیں؟ اب تو بسبیل تنزّل اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ تاریخ اور علم الآثار کے محققین سر جوڑ کر بیٹھیں۔ ان یادگاروں کی جو تفاصیل میسر آئیں ان کے مطابق ان کے نقشے مرتب کئے جائیں۔ مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کے قرب و جوار میں ڈزنی لینڈ کے انداز کا وسیع و عریض عجائب گھر قائم کیا جائے، جن میں ان نقشوں کے مطابق ان مقدس یادگاروں کے مثنے تعمیر کر کے رکھے جائیں۔ اس سے کم از کم ذوقِ نظر کی تسکین تو ہو جائے گی۔

میں نے اپنے احساسات کے اس حصّے کو اس لئے قلمبند کرنا ضروری سمجھا ہے کہ (آج نہیں تو شاید کل) کسی کو اس تجویز کی اہمیت کا احساس ہو جائے اور کوئی جماعت یا مملکت، اس منصوبے کو بروئے کار لانے کی سعادت حاصل کرے۔

(۰)

آگے بڑھنے سے پہلے میں اتنا عرض کر دوں کہ میں نے اپنی مختلف تصنیفات (بالخصوص مطالب الفرقان۔ حصہ سوم) میں، کعبہ، حج، عمرہ اور ان سے متعلق مناسک کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے کہ دین (اسلامی نظام) کے پروگرام میں ان کی اہمیت کیا تھی اور ان سے کس قدر انقلاب آفریں نتائج مرتب ہوتے تھے۔ اور اب (تو "مذہب اسلام" میں) ان کی حیثیت کیا رہ گئی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کی تاکید کیا کرتا ہوں کہ (ان جزئیات کو چھوڑ کر جو قرآن کے خلاف ہوں) ان کا باقی رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سردست (کم از کم) ان سے ہمارا ملّی تشخص تو قائم ہے۔ ان کے ساتھ، میں یہ بھی تاکید کیا کرتا ہوں کہ ہمیں قرآنی نظام کے قائم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے، جس کا قدم اوّلین وہ تعلیم ہے جس سے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر، قرآنی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ دعا کے مفہوم کے متعلق بھی میں مطالب الفرقان میں (دعا اور تقدیر کے عنوانات کے تحت) تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ ان دیارو امصار کی کشش و جاذبیت کا سبب ان کے اینٹ اور پتھر نہیں، بلکہ یہ ہمارے اپنے جذبات کا مظاہرہ ہے۔ جس قسم کے ہمارے جذبات اسی قسم کا ان اینٹوں اور پتھروں کا تاثر۔ اس نکتہ کی وضاحت کسی دوسرے وقت کی جائے گی۔

(۰)

کویت

کویت میں ہمارا قیام، عزیزم عمردراز خان کے مکان پر ہوا جہاں مجھے اپنے گھر کی سی راحت میسّر آگئی۔ کویت میں میری قرآنی فکر کا چرچا تو ایک عرصہ سے ہو رہا تھا، لیکن اس سے پہلے مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے۔ اس آواز کے نقیب احباب میں سے چند ایک سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ باقیوں سے یہاں آکر ہی ملا اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا ذہن بڑا روشن اور فکر بڑی تابان ہے۔ عمردراز صاحب کے مکان پہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے اور بھی مسرت ہوئی کہ ان میں خواتین کی تعداد بھی کافی تھی۔ یہ تمام احباب، میرے خطابات اور درس تو (ٹیپ کے ذریعے) مسلسل سنتے چلے آرہے تھے۔ اس لئے طے یہ پایا کہ (کسی خطاب کے بجائے) سوال وجواب کا سلسلہ زیادہ مفید رہے گا، تاکہ جسے کسی نکتہ کی وضاحت مطلوب ہو۔ کسی شبہ کا ازالہ درکار ہو، کسی اجمال کی تفصیل مقصود ہو، وہ بالمشافہ دریافت کرلے۔ یہ اندازِ افہام وتفہیم بڑا مفید رہا۔ عمردراز صاحب کے مکان کے علاوہ، دو جگہ اور بھی اجتماعات منعقد ہوئے۔ ایک عزیزم عبیدالرحمٰن ارائیں کے مکان پر۔ ان کا نام نوکِ قلم پر آتے ہی ماضی کی چند حسین یادوں کے دریچے کھل گئے۔ غالباً ۱۹۵۰ء میں، میں نے کراچی میں جب درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو اس کی صورت یہ تھی کہ، نیپیئر بیرکس، فاؤلرز لائن کے مکان کے صحن میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے، دو ایک چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ اور تین یا چار سامعین ان پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ ان السابقون الاوّلون میں، (ڈاکٹر سعید مرحوم کے علاوہ، جن کے ایما پر درس کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا) عبدالرحمٰن ارائیں نامی ایک صاحب بھی شریک ہوتے۔ ان کے ساتھ ان کے (چھوٹی چھوٹی عمر کے) صاحبزادے بھی آتے۔ اس ابتداء، اور اس کے بعد ان کی تربیت سے ان بچوں کے قلب میں فہم قرآنی کا ایسا بیج بویا گیا کہ وہ وقت کے ساتھ شاخِ ثمردار بنتا چلا گیا۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا، عزیزم عطاء الرحمٰن ارائیں (انجنیئر) لاہور میں مقیم ہے اور فکرِ قرآنی کا نہایت متین اور باسلیقہ مبلّغ۔ دوسرے دو بیٹے، عبیدالرحمٰن ارائیں (انجنیئر) اور عتیق الرحمٰن (ڈاکٹر) کویت میں ہیں، اور فکرِ قرآنی سے وابستہ۔ انہی عبیدالرحمٰن ارائیں کے مکان پر ایک اجتماع ہوا۔ جس میں اچھے خاصے روشن خیال ارباب فکر ودانش شریک تھے۔ ایک اجتماع محترم شفیق صاحب کے مکان پر ہوا جو سفرِ حجاز میں شریکِ کارواں تھے۔ یہ اجتماع بھی بڑا کامیاب تھا۔ ان اجتماعات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب یہ قرآنی فکر (بفضلہ تعالیٰ) اربابِ علم وبصیرت کے دلوں میں گھر کر رہی ہے، اور یہی درحقیقت اس کے صحیح مساکن ہیں۔ اس کا سہرا عزیزم عمردراز خان، اور ان کے قدیم رفقاء کے سر ہے جنہوں نے نہایت التزام اور استقامت سے اس چراغ کو روشن رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی میں مزید برکت عطا فرمائے۔

دہران کے قرآنی احباب کو میرے وہاں نہ جاسکنے کا جس قدر افسوس ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ قریب قریب ہر روز ان کی طرف سے ٹیلی فون آجاتا تھا۔ ایک دن تو انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ

قریب پندرہ منٹ تک، ٹیلی فون پر، مجھ سے پیغامات حاصل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے شوقِ فراواں کو مزید شادابی عطا فرمائے۔

کویت کے احباب کا تقاضا تو بے پایاں تھا لیکن میرے لئے مرکز کی طرف جلد از جلد لوٹنا بھی ضروری تھی۔ میاں ظفر محمود صاحب ۲۵ راپریل کی شب، جانبِ کراچی روانہ ہو گئے تاکہ (میرے وہاں پہنچنے سے پہلے) وہاں کے انتظامات کا جائزہ لے لیں۔ میں، احبابِ کویت کو تشنہ کام چھوڑ کر، ۲۶ راپریل کی شب عازمِ کراچی ہوا۔ ایئرپورٹ پر ان کے ہجوم نے یہ کہہ کر مجھے اذنِ رخصت دیا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

کویت سے کراچی کا سفر بڑا اکھٹن ہے۔ جہاز رات کو وہاں سے روانہ ہو کر، صبح کے وقت کراچی پہنچتا ہے۔ ایک تو رات بھر کا رتجگا۔ پھر تنہائی (کیونکہ رفیقِ عزیز ظفر صاحب پہلے جا چکے تھے) لیکن یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ میرا خدا، ہر مقام پر میری بیکسی کی شرم رکھ لیتا ہے۔ کویت کے قرآنی احباب میں ایک صاحب (محترم عبدالعزیز بھٹی) انگلینڈ سے واپس آئے۔ انہوں نے اپنے وطن (ڈسکہ) جانے کے لئے اسی رات کراچی آنا تھا۔ انہوں نے میری روانگی کا سنا تو اپنے جہاز کو چھوڑ کر، میرے جہاز میں نشست حاصل کر لی۔ اور ان کی مشفقانہ رفاقت نے تنہائی محسوس ہی نہ ہونے دی۔ صبح کراچی اترا، تو عزیزم خالد سامنے کھڑا تھا۔

کراچی

تقسیمِ ہند کے بعد، کراچی میرا پہلا وطن تھا۔ میں نے (پاکستان میں) اپنی قرآنی تحریک کی ابتدا یہیں سے کی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں، مستقل طور پر لاہور منتقل ہو گیا تو (پھر بھی) وقتاً فوقتاً کراچی آنا جانا رہا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسے موانعات پیش آتے رہے کہ (احباب نے بتایا کہ میں) سترہ سال کے بعد کراچی آیا ہوں۔ اس عرصہ میں کراچی کچھ اس طرح بدلی کہ میں اس کے کسی حصے کو بھی پہچان نہ سکا۔ (للہ الحمد کہ قرآنی احباب کے دلوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی) ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کے عزیز، محترم فضل احمد بٹ، کراچی میں مقیم ہیں۔ میں نے انہیں کے ہاں ٹھہرنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ ان کا گھر میرے لئے بمنزلہ اپنے گھر کے ہے۔ عزیزم خالد بھی وہیں تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے اور بھی آرام ملا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، میں نے اپنی تحریک کا آغاز کراچی ہی سے کیا تھا۔ (۱۹۵۸ء میں) جب میں وہاں سے لاہور منتقل ہوا ہوں، تو قرآن کی آواز پھیل رہی تھی لیکن اس کی رفتار قدرے سست تھی۔ اب یہ دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی کہ یہاں مختلف مقامات پر قرآنی آواز کے مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی سرگرمیاں بھی پہلے سے کہیں زیادہ برق پا ہیں۔ میں نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی پبلک اجتماع کا انتظام نہ کریں۔ نہ ہی میرے کراچی کے ورود کا چرچا کریں، کیونکہ اس صورت میں میرے لئے کراچی سے دامن چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود، نجی اجتماعات میں بھی شرکاء کی بڑی کثرت تھی۔ (ریٹائرڈ) میجر جنرل احسان الحق صاحب نے (جن کے ساتھ میرے قدیمی تعلقات ہیں) ایک قرآنی حلقہ قائم کر رکھا ہے جس میں اعلیٰ مناصب پر فائز اربابِ علم و دانش شریک ہوتے ہیں۔ ان کے

ہاں بھی ایک اجتماع ہوا جس میں خواتین بھی بکثرت شریک تھیں۔ عزیزم منصور ظہیر کے ساتھ بھی میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ ان کے ہاں دو اجتماعات ہوئے اور بڑے کامیاب۔ انداز سوال و جواب ہی کا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب سوالات، انکار و اقرار حدیث اور تعین نمازوں اور نوروزوں سے آگے بڑھ کر زندگی کے عملی مسائل سے متعلق ہو چکے ہیں۔ بالخصوص اسلامی نظامِ مملکت۔ اسلامی قانون سازی۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی نظامِ معیشت سے متعلق۔ خواتین کو اگرچہ برقعہ اور ساڑھی کی کشمکش میں الجھا دیا گیا ہے، لیکن انہوں نے بھی زیادہ تر بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق سوالات کئے۔ مرکز ہر سوال کا قرآن تھا۔

کراچی کے چار دن کے قیام میں، بعض دیرینہ دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں ان کے نام نہیں لینا چاہتا کیونکہ اگر (سہواً) کسی ایک کا نام بھی لکھنے سے رہ گیا تو انہیں شکایت پیدا ہو جائے گی جو میں قطعاً نہیں چاہتا۔ یہ تمام دوست بڑے مخلص اور میرے لئے یکساں واجب الاحترام ہیں۔ خدا ان سب کو خوش و خرم رکھے۔ ان کے ساتھ میرے ماضی کی بڑی حسین یادیں وابستہ ہیں ——— ملازمت کی زندگی۔ تحریکِ پاکستان کی زندگی۔ تشکیلِ پاکستان کی زندگی۔

۳۰ اپریل کی شب، احباب کو با چشمِ نم چھوڑ کر، لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ عزیزم خالد سلمہا (بیوی بچوں سمیت) اس سفر میں بھی میرے لئے عصائے پیری تھا۔ دس بجے شب، ایئرپورٹ پر جملہ اہلِ خانہ کو خوش و خرم موجود پایا۔

(٠)

شکریہ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، اس سعادت کے حصول کی آرزو ساری عمر میرے سینے میں مچلتی رہی۔ عمر کے اس آخری حصہ اور صحت کی خرابی نیز حوادث کے صدمات کی بناء پر میں اس کی طرف سے اب مایوس ہو چکا تھا کہ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے یکسر غیر متوقع طور پر ایسے اسباب پیدا کر دئیے جن سے زندگی کی یہ دیرینہ آرزو، اس حسن و خوبی سے بر آئی جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے میں بدرگاہِ ربّ العزت سجدہ ریز ہوں، اور اس کے بعد ان تمام احباب کا صمیمِ قلب شکر گذار جن کی محبت، شفقت اور رفاقت سے یہ مراحل ایسے پُر آسائش طور پر طے ہو گئے کہ مجھے صعوبتِ سفر کا احساس تک نہیں ہوا۔ زندگی میں ایسے پُرخلوص احباب کا میسّر آ جانا بجائے خویش، نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیاب و کامران فرمائے۔

اگر اس کا کوئی صلہ ملنا ہے تو میں بحضورِ ربِ کریم گذارش کروں گا کہ

میرے قافلے میں لٹا دے اسے ‍ ‍ ‍ لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

کہ یہ ما حصل، انہی کی کاوشوں اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

رہینِ منّت : **پرویز**

(٠)

دُنیا کا سب سے پہلا انسان

جنوبی ہند (کرناٹک، مدراس وغیرہ) کا ذکر آتے ہی ذہن میں یہ خیال اُبھرتا ہے کہ وہاں کے مسلمان قدیم توہم پرستیوں کا شکار ہوں گے اور اسلام کے متعلق ان کا تصور وہی قدامت پرستانہ، جہالت آمیز ہو گا۔ لیکن بعض شواہد ایسے سامنے آتے ہیں جن سے اس قسم کے تصور کی تغلیط ہوتی ہے اور یہ نظر آتا ہے کہ وہاں ایسے ارباب دانش و بینش موجود ہیں جو قرآن کریم کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھتے ہیں اور اسلام کے متعلق ان کا تصور بڑا روشن و تابناک ہے۔ اس کی شہادت زیرِ نظر مضمون سے ملتی ہے۔ مضمون نگار ہیں خطیب عبدالرحمٰن عمری۔ سابق اُردو منشی۔ مظہر العلوم ہائر سکنڈری اسکول۔ آمبور (مدراس) جسے محترم ڈی۔ جے۔ محمد مظہر حسین آمبور (مدراس) نے ارسال فرمایا ہے۔ اسے بلاترمیم شائع کیا جا رہا ہے۔

(طلوع اسلام)

سب سے پہلا انسان دنیا میں کس طرح پیدا ہو گیا؟ اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے "اللہ نے سب سے پہلے ساری زمین سے تھوڑی تھوڑی مٹی لے کر ایک پتلا بنایا جس میں اپنی جان ڈال دی پھر اس پتلے کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی یہی آدم و حوا ہیں۔ اس جوڑے سے اولاد کا سلسلہ جاری ہو گیا اور ساری دنیا انسانوں سے آباد ہو گئی ہے۔" چونکہ یہ قرآنی جواب نہیں۔ ہمارے لئے اطمینان بخش نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک حق شناس عبد مومن، قرآن جیسی علم و بصیرت کی کتاب کو اپنی علمی تحقیق کا موضوع نہ بنا کر مجرمانہ تغافل نہیں کر سکتا ہے۔ آیئے ذرا قرآن کریم کے اوراق الٹ کر دیکھیں کہ اس باب میں اس کے ارشادات کیا ہیں؟

اس میں شک نہیں قرآن مجید سائنس کی تحقیقات کی کتاب نہیں۔ اس کا اصل موضوع نوع انسانی کے لئے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جس میں شرف انسانیت اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کی وضاحت کے سلسلہ میں ضمناً جن چیزوں کا ذکر اور اشارہ ہے وہ ہرگز خلاف حقیقت نہیں ہو سکتا۔ یورپ کے محققین کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ انہوں نے دیگر مذہبی کتابوں کی طرح قرآن مجید کو بھی "توہم انگیز افسانوں کا مجموعہ" سمجھ کر اس کے علم و بصیرت سے مستفید نہ ہو سکے۔ بحیثیت عبد مومن ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ انسانی تخلیق کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔

یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ مشیتِ خداوندی کے عظیم المرتبت امور میں ایک اہم اسکیم دنیا میں انسانوں کو آباد کرنا ہے۔ انسانی تخلیق کے متعلق قرآن کی مختلف آیات میں مختلف طرح کا ذکر ہے۔ مثلاً ارض، طین، طِینٍ لازب، سلالۃ من طین، سلالۃ من ماءٍ مھین، من الماءِ حیٍ، اور نفسٍ واحدۃٍ وغیرہم سے انسانی تخلیق کا ذکر ہے۔ ان سے تضاد بیانی کی غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے۔ مختلف آیات سے تخلیقِ انسانی کی تمام تفصیلات کا یہاں نہایت اختصار صرف اسی قدر ہے "خاک کے ذرے مختلف مراحل سے گذر کر اور مختلف ارتقائی منازل طے کر کے قرنہا قرن کی طویل مدتوں کے بعد انسانی صورت میں متشکل ہو گئے" یعنی خاک کے پردے سے آدم خاکی کا

ظہور ہوا۔ حضرت میرؔ نے کیا خوب کہا ہے:-

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

پھر قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کی یہ موجودہ زندگی اصل زندگی نہیں ہے بلکہ یہ آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ انسان کی متنوع مراحل کی تفصیل قرآن مجید میں عجیب انداز میں کہی ہوئی ہے۔

۱۔ وہ کہتا ہے اللہ نے انسان کی تخلیق کا آغاز طین سے کیا ہے۔ وبدا خلق الانسان من طین اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔

۲۔ ایک اور جگہ مٹی کے خلاصہ کا ذکر ہے۔ مٹی کے پتلے سے بنانے کا ذکر نہیں ہے۔ ولقد خلقنا الانسان من سللۃ من طین۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شے کی نشوونما مٹی کے خلاصہ سے ہی ہوتی ہے۔ اور انسانی زندگی کا نقطہ آغاز بھی یہی طین کا جھلہ ہے کیونکہ یہیں جراثیم حیات نشوونما پا تے ہیں۔

۳۔ وجعلنا من الماء کل شیء حی افلا یؤمنون۔ ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا ہے۔ کیا اس حقیقت پر ایمان نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جرثومہ حیات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ پانی اور مٹی کے خلاصہ کے امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ (CELL) کی شکل اختیار کی۔ اس طرح انسانی تخلیق خاک سے آب کی طرف منتقل ہوئی۔ اسی خلیہ کی شکل کو قرآن نے طین لازب سے تعبیر کیا ہے۔

۴۔ انا خلقناھم من طین لازب۔ ہم نے انسان کو طین لازب سے بنایا۔

۵۔ اور ایک مقام پر ہے ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حماٍ مسنون اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا پھر جرثومہ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ماہرین حیات میں ایک ایسی دارا دہ ہوتا ہے۔ حیات کا یہ نقطہ آغاز "نفس واحدہ" ہے۔ ایک خلیہ خاص حد تک پہنچ کر دو حصوں میں بٹ جاتا ہے جنہیں (DAUGHTER CELLS) کہا جاتا ہے۔ اس نفس واحدہ سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کا الگ نوع سمجھیں تو ان تمام شاخوں میں سربلند نوع انسان کی شاخ ہے جو نفس واحدہ سے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی درجہ بدرجہ اس بلندی تک آ پہنچی ہے۔ پھر اس نفس واحدہ سے سلسلہ تخلیق آگے بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ اس پیکر بشریت کے مقام تک پہنچا جو حیات ارضی میں اس کی جائے قرار ہے۔

۶۔ وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ فمستقر و مستودع قد فصلنا الایت لقوم یفقھون۔ وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقت معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ پھر تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ بے شک ہم نے اپنی قدرت کی نشانیوں کو سمجھدار قوم کے لئے بالتفصیل بیان کر دیا ہے۔ پھر یہ جراثیم حیات ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے میں ہزاروں سال گزر گئے جس کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوگیا۔

۷۔ ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماءٍ مھین۔ پھر اس کی نسل کو رقیق پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

پھر قرآن نے یہ بتایا کہ حیوانی زندگی کا سلسلہ افزائش نسل بذریعہ تولید شروع ہوا اور آگے بڑھتا گیا۔ یہ مختلف اقسام کی مخلوق اصل میں ایک ہی نوع کی ہیں۔

۸۔ وما من دابۃ فی الارض ولا طیر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ما فرطنا فی الکتب من شیء ثم الی ربھم

یحشرون ۔ اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جو تمہاری طرح کی نوع نہ ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے قانون ہی کے مطابق ہو رہا ہے جس کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سے عطا شدہ قانون پر جمع ہیں۔

جب بذریعہ تناسل تمام مخلوق کا سلسلہ افزائش نسل ہوا تو نر و مادہ کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

۹۔ واللہ خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم جعلکم ازواجا۔

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑا بنایا۔ ایک دوسری جگہ ہے ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنا دیا۔

پورا قرآن پڑھ جایئے آپ کو کہیں نہیں ملے گا کہ آدم کی پسلی چیر کر حوا پیدا کی گئی۔ یہ خیال خلافِ حقیقت ہے۔ اور یہ بھی مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اللہ نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔ ومن کل شیئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون۔ اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنا دیئے ہیں تاکہ تم قانونِ خداوندی کا خیال رکھ سکو۔

اس تمہید کے بعد اصل توضیح کی طرف آیئے۔ نفس واحدہ پیکر حیوانی میں عرصہ دراز گزار کر بھی انسانی قابل ذکر شے نہ تھا۔

۱۰۔ ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئا مذکورا۔ کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزرا جب یہ قابل ذکر شے نہ تھا۔ پیکر حیوانی کو تدریجا سنوارا گیا اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس کے اعضاء و جوارح میں تناسب پیدا کیا۔ پھر اسے احسن تقویم عطا فرمائی۔ اس احسن تقویم و احسن صورہ میں کونسی امتیازی خصوصیت اور کونسا خصوصی جوہر ہے۔ جس کی بنا پر اسے تمام حیوانوں پر فوقیت اور شرف دیا گیا۔ قرآن کریم اسے اس طرح بیان کرتا ہے۔ "ثم سوٰیہ و نفخ فیہ من روحہ" پھر اس نے اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی۔

یہ روح خداوندی کیا ہے؟ اور اس نفخ روح سے حاصل کیا ہوا؟ اس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکر آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا۔ اور اس سے حاصل یہ ہوا، وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون۔ اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور فواد بنا دیا لیکن کم ہی لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کا شکر بجا لاتے ہیں۔ یہاں نفخ روح سے سمع بصر و فواد عطا ہونے کا ذکر ہے۔ گو بظاہر یہ تین لفظ ہیں مگر ان تینوں میں شرف و مجد انسانیت کی پوری پوری دنیا سمٹ کر آ گئی ہے۔ یعنی انسان کو درجہ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اللہ نے اس میں اپنی روح "خدائی توانائی" (DIVINE ENERGY) کا شمہ ڈالا تو وہ اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنے لئے کچھ فیصلہ کر سکے اس فیصلہ کی صلاحیت ہی کا دوسرا نام اختیار و ارادہ ہے۔ اسی سے انسان ایک ذمہ دار مخلوق بن گیا ہے۔ اس ارادہ و اختیار والے انسان کے بغیر یہ دنیا بے رنگ و بے کیف رہتی۔ یہ سب نفخ روح کی سحر کاریاں ہیں۔ جس کے سبب اس میں صفات خداوندی، محدود شکل میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ یہ خصوصیت کسی اور مخلوق میں نہیں ہے یہی وہ نفخ روح ہے جس سے یہ آدم خاکی مسجود ملائکہ قرار پایا ہے۔ سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آیا ہے؟ اس سوال کا از روئے قرآن مجید یہ ہے جواب جو علم و عقل، دانش و بینش کے عین مطابق ہے اور یہ بیانِ حقیقت اس زمانہ میں ہوا ہے جبکہ دنیا سائنس سے بالکل نا آشنا تھی قرآن کے اس اعجاز کا کون منکر ہو سکتا ہے۔ مغربی سائنسدانوں کے جو انکشافات سامنے آ رہے ہیں انہیں قرآن کریم نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔

یہاں "نفخ روح" کا صحیح مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس سے یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اللہ نے اپنی روح میں سے کچھ

حصہ انسان میں داخل نہیں کیا ہے۔ اس لئے یہ تصور کہ انسانی روح ارتقائی منازل طے کرتے کرتے آخرالامر خدا کی ذات میں جا کر مل جاتی ہے یکسر غلط اور غیر قرآنی ہے۔ یہ ہندوؤں کے ویدانت کا عقیدہ، ہمارے ہاں تصوف کی راہ سے جگہ پا گیا ہے۔ دراصل روح کے معنی توانائی کے ہیں۔ یہی خدائی توانائی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے جو انسانی اختیار و ارادہ کی حامل ہے۔ اور اسی سے خدائی صفات محدود طریقہ پر اختیار کرنے کی صلاحیت و استعداد ہے اور یہ اسی سے دوسرے حیوانوں سے ممتاز ہو گیا ہے چلر روح و مادہ کے امتزاج سے کہیں انسان کے ازلی و ابدی ہونے کا دعویٰ کا نہ ہو جائے۔ اس لئے قرآن واضح طور پر کہتا ہے اس پر ایک زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے کہ یہ قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھا۔ لم یکن شیئاً مذکوراً۔ اور ولم تک شیئاً تم کوئی شے نہیں تھے۔ یہ تو تھی ہماری ابتدا۔ پھر انتہا کی طرف توجہ دلاتا ہے اور کہتا ہے "انسان جو اس بزم کائنات کا صدر اعلیٰ ہے کیا وہ بلامقصد پیدا کر دیا گیا ہے؟ جبکہ کائنات کی کوئی شے بلامقصد پیدا نہیں کی گئی ہے۔ تو یہ بلاغرض و غایت کیوں پیدا کیا جاتا؟ افحسبتم انما خلقناکم عبثاً وانکم الینا لا ترجعون۔ غرض انسان کی موجودہ زندگی آخری منزل نہیں ہے۔ ہماری طبعی زندگی ایک مدت کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن نفخ روح کی وجہ سے طبعی موت کے بعد بھی ہماری زندگی باقی رہتی ہے۔ اس پر طبعی قوانین اثر نہیں کرتے ہیں۔ یہی وہ زندگی ہے جسے قرآن نے حیاتِ اُخروی سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے ضابطۂ حیات پر زندگی گزارنے سے شرفِ انسانیت کا رتبہ ملے گا اور فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی صورت ہو گی۔

(○)

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۱۵۰ روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۴۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

مطالب الفرقان جلد چہارم

پرویز صاحب کے فہم و تفہیم قرآن کے انداز سے آپ واقف ہیں۔ قرآنی الفاظ کے مفہوم کا تعین زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان کی رُو سے۔ اور آیاتِ قرآنی کا مفہوم خود قرآن کریم کی دیگر آیات کی روشنی میں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے لغات القرآن ــــ مفہوم القرآن۔ اور ــ بتویب القرآن مرتب کئے اور پھر تفسیر قرآن مجید کا مسلسل سلسلہ شروع کیا۔ اس کی چوتھی جلد، سورۂ آلِ عمران، سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ پر مشتمل قریب ساڑھے چھ سو صفحات پر چھپی ہوئی ہے۔ اس کے نمایاں موضوعات یوں سامنے آتے ہیں:۔

- آیاتِ محکمات و متشابہات۔
- حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ کے احوال و کوائف۔
- حضرت مریمؑ کی انقلاب انگیز زندگی۔
- حضرت عیسیٰؑ کی داستانِ حیات۔
- بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ۔
- مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کے خلاف سرکشی۔
- رومن شاہنشاہیت کے خلاف بغاوت۔
- واقعۂ صلیب کی تفصیلی سرگزشت۔
- معجزات کی حقیقت۔
- وفات و نزولِ مسیح کی بحث۔
- تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں بصیرت افروز انکشافات۔
- اسلامی نظام۔
- سنّت اور حدیث کی صحیح پوزیشن۔
- اطاعتِ خدا اور رسول کا قرآنی مفہوم۔
- ترکہ اور وراثت کے احکام اور تقسیم۔
- یتیم پوتے کی وراثت۔
- حدود (جرائم کی قرآنی سزائیں)۔
- قطع ید وغیرہ۔

ان چند ایک عنوانات سے کتاب کے مندرجات کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اسے ادارہ طلوعِ اسلام کے اشاعتی معیار کے مطابق، دلکش اور پائیدار انداز سے طبع کیا گیا ہے۔ عام کتابوں کے مقابلہ میں ضخامت کے قریب دگنا ہو جانے کی وجہ سے قیمت ۔/۹۰ روپے (ڈاک خرچ ۔/۸ روپے) مقرر کی گئی ہے۔

ــــــــ ملنے کے پتے:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

سربستہ حقیقتیں بے نقاب — اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی پُرہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نورِ حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوّف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوّف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کُنہ و ماہیّت کیا ہے۔ وارداتِ قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو ردِّعمل حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں، ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوّف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی اہم تصنیف

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو باب ہیں — اوّل، تصوّف اور اسلام — دوم، تصوّف اور اقبالؒ — مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ — کتابت، طباعت کاغذ عمدہ — جلد مزیّن اور مطلّا — ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/25 روپے
(محصول ڈاک -/5 ")

ملنے کا پتہ:

(1) ادارہ طلوعِ اسلام 25/بی گلبرگ 2۔ لاہور 11 (2) مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور